محمود، فاروق، فرزانہ اور
انسپکٹر جمشید کے کارنامے ۸
بھیانک سازش
اشتیاق احمد
Uploaded for:
www.urdufanz.com
By: SHJ3

بار اوّل : اپریل ۱۹۸۰ء
تعداد : دو ہزار
مطبع : محبوب پرنٹنگ کارپوریشن
کتابت : نوید کمال
قیمت : 5/50

مکتبہ اشتیاق
۲۔ شیخ سٹریٹ ۶۸ اسلام پورہ لاہور

دو باتیں

کالی آنکھ کے ساتھ آپ کو بھیانک سازش بھی پڑھنے کو ملے گی، کہانی آپ کو ہر لمحے چونکائے گی، اگر آپ نہ چونکے تو یہ کہانی کا قصور نہیں، آپ کا اپنا ہوگا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کو چونکنا نہیں آتا، حالانکہ یہ کوئی مشکل کام ہرگز نہیں، دیکھیے نا، محمود، فاروق اور فرزانہ کس طرح چونکتے ہیں، اگر آپ چونکنے کے فن سے ناآشنا ہیں تو انہی سے سیکھ لیجیے، یہ آپ کو بلا معاوضہ چونکنا سکھا دیں گے، کیا خیال ہے، کہیں میں چونکنے اور چونکانے کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا، اور یہ دو باتیں آپ کے لیے بوریت کا سامان تو نہیں بن گئیں، اگر ایسا ہے تو میں انہی الفاظ پہ انہیں ختم کیے دیتا ہوں، لیکن پھر آپ کہیں گے، اس مرتبہ دو باتیں ایک بات بن کر رہ گئی اور آدھی ملاقات چوتھائی ملاقات رہ گئی، میں یہ نہیں چاہتا، میں تو آپ سے پوری ملاقات کرنے کا خواہش مند رہتا ہوں اور سوچ رہا ہوں، دو باتوں کی بجائے چار باتیں کیوں نہ شروع کر دوں، اچھا بس۔ اگلا ناول "ڈریکولا کا بھوت" ہوگا۔

اشتیاق احمد

ترتیب

سُرخ فائل

محمود کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ پڑا اور اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں، اس کے اوپر ایک بھیانک سی صورت والا آدمی جھکا ہوا تھا، اس کے دونوں بازو اس کے ایک ہاتھ میں جکڑے ہوئے تھے۔ محمود نے دیکھا، اس کے چہرے کا رنگ سیاہ تھا، آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ پیشانی کے درمیان میں ایک گہرے زخم کا نشان تھا جو ناک کی نوک تک چلا آیا تھا اور اس زخم نے اس کے چہرے کو حد درجے خوف ناک بنا دیا تھا۔ اس کے سیاہ ہاتھوں اور بازوؤں پر لمبے لمبے گھنے بال تھے، جن کی وجہ سے وہ اور بھی بھدے لگ رہے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک خونی چمک تھی، یوں جیسے آگ سی دہک رہی ہو۔

کمرے میں زیرو کا بلب روشن تھا، سوتے وقت وہ زیرو کا بلب جلا کر سونے کے عادی تھے.... پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی اندر سے بند تھی اور کمرے کا دروازہ بھی اندر سے

بند تھا... اس نے سوچا، فاروق اور فرزانہ کو کسی طرح جگانا چاہیے۔
کیونکہ وہ جان چکا تھا، حملہ آور بہت طاقت ور تھا اور پورا
زور لگا کر بھی وہ اس سے اپنے ہاتھ نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اس
نے حلق سے آواز نکالی:

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو۔"

اس کی آواز میں تیزی تھی، گونج تھی، لیکن آواز بلند نہیں نکل
تھی، تاہم اس کا خیال یہی تھا کہ فاروق یا فرزانہ میں سے کوئی
ایک اس کی آواز سن کر ضرور جاگ جائے گا، لیکن اس طرف
کسی حرکت کے آثار نظر نہ آئے، وہ گردن گھما کر ان کی طرف
دیکھ بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ دوسرے ہاتھ سے اس خوف ناک
آدمی نے اس کا سر پکڑ رکھا تھا۔ اس نے سر کو نہ جانے کس
طرح دبا رکھا تھا کہ اس کے حلق سے نکلنے والی آواز زیادہ اونچی
نہیں تھی، حالانکہ اس نے کوشش یہی کی تھی کہ آواز اونچی نکلے۔
اس کے حلق سے آواز نکلتے ہی کھوپڑی پر دباؤ اور بڑھ گیا
اور محمود نے محسوس کیا، اب وہ بالکل ہی آواز نہیں نکال سکے،
اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا اور وہ سوچنے لگا، یا اللہ... یہ کیا
مصیبت نازل ہو گئی ہے بیٹھے بٹھائے... اگر وہ فاروق کے
سامنے لیٹے ہوئے یہ جملہ کہہ بیٹھتا تو وہ ضرور جواب میں کہہ اٹھتا۔
بیٹھے بٹھائے نہیں لیٹے لٹائے۔ اچانک خوف ناک آدمی کے

ہونٹ ہلے اور ان سے ایک بالکل باریک سی آواز نکلی:

"پہلے ایک نظر اپنے بہن بھائیوں پر ڈال لو!"

اور یہ کہتے ہوئے اس نے کھوپڑی پر جمے ہاتھ کو حرکت دی۔
اس کا سر دائیں طرف گھوم گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دھک سے
رہ گیا۔ فاروق اور فرزانہ کے سروں پر بھی ایک ایک آدمی کھڑا
تھا، یہ دونوں بھی اسی جیسی شکل و صورت کے خوفناک آدمی تھے،
البتہ ان کی پیشانیوں پر زخم نہیں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چمکتے
خنجر تھے اور ان خنجروں کی نوکیں فاروق اور فرزانہ کی گردنوں پر
تھیں، اس طرح وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔

"آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو۔" محمود نے بڑی مشکل سے پھنسی پھنسی
آواز میں کہا۔ وہ جان گیا تھا، اس وقت بری طرح پھنس گئے ہیں،
اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ یہ لوگ اندر کس طرح داخل
ہوئے، کیونکہ شدید سردی کے دن تھے اور وہ تمام دروازے
اور کھڑکیاں اندر سے بند کر کے سوتے تھے، یہاں تک کہ چھت
کے زینے کا دروازہ بھی بند رہتا تھا، ان حالات میں یہ لوگ اندر
کس طرح داخل ہوئے تھے، یہ اپنی جگہ ایک عجیب بات تھی اور
اس کا جواب بھی اسے نہیں سوجھ رہا تھا، لیکن یہ مسئلہ تو تھا بعد
کا، ابھی تو یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ سب چکر کیا ہے۔ ویسے یہ
اندازہ تو وہ لگا ہی چکا تھا کہ باقاعدہ پروگرام بنا کر حملہ کیا گیا ہے۔

"تمہارے بھائی بہن اسی عالم میں کمرے میں لیٹے رہیں گے، میرے دونوں ساتھی اسی طرح خنجر ان کی گردنوں پر رکھے کھڑے رہیں گے اور تم میرے ساتھ اندر چلو گے. تم مجھے لے کر اپنے ابا جان کے کمرے کے دروازے پر جاؤ گے اور ان سے دروازہ کھلواؤ گے، یہ بات انہیں پہلے ہی بتا دو گے کہ تم تینوں زبردست خطرے میں ہو اور وہ کوئی غلط قدم نہ اُٹھائیں، کیونکہ اِدھر کسی گڑبڑ کی آواز ان کے کانوں تک پہنچے گی، اُدھر میرے دونوں ساتھی تمہارے بھائی بہن کا گلا کاٹ دیں گے، کمرے کا دروازہ یہ پہلے ہی اندر سے بند کر لیں گے. اب تم اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ." وہ کہتا چلا گیا.

اُٹھتے ہوئے اس نے محسوس کیا، ٹانگوں میں سے جان نکلتی جا رہی ہے. اس نے بے بسی کے عالم میں فاروق اور فرزانہ کی طرف دیکھا، وہ دھیرے سے مسکرائے. ان کی مسکراہٹوں نے اسے حوصلہ بخشا اور وہ سیدھا کھڑا ہو گیا.

"بہت خوب.... تم ان لمحات میں بھی مسکرا سکتے ہو، مجھے خوشی ہوئی."

"تم بھی مسکراؤ.... کہ مسکرانا ہی زندگی ہے." فاروق نے کہا.

"خاموش تم آپس میں باتیں نہیں کرو گے." زخمی پیشانی والے نے سرد آواز میں کہا. اس کے ساتھ ہی فاروق اور فرزانہ کو

خنجروں کی نوکیں کھال میں داخل ہوتی محسوس ہوئیں. ان کے منہ سے سسکیاں نکل گئیں، دوسری طرف محمود کی کھوپڑی پر گرفت اور بڑھ گئی تھی. آخر وہ کمرے کے دروازے کی طرف چل پڑا. اس نے چٹخنی گرائی اور باہر نکل آیا، فوراً ہی کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا. ظاہر ہے، اس کام کے لیے ایک حملہ آور کو خنجر ہٹا کر دروازے تک آنا پڑا ہو گا، لیکن محمود جانتا تھا، فاروق یا فرزانہ کچھ نہیں کر سکیں گے، ظاہر ہے، ایک کی گردن سے خنجر ہٹا تھا، دوسرے کی گردن پر تو جوں کا توں موجود تھا.

وہ اپنے ابا جان کے کمرے کے دروازے پر جا کر رک گیا، اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا. وہ نہیں جانتا تھا: اندر کیا ہونے والا ہے، یہ لوگ کیا کرنے والے ہیں، ساتھ ہی وہ محسوس کر رہا تھا، اس مرتبہ وہ بہت بڑے پھنسے. آخر اس نے دروازے پر دستک دی. کلائی کی گھڑی پر وہ نظر نہیں ڈال سکا تھا، کیونکہ کلائیاں تو اس خوفناک آدمی کی گرفت میں تھیں، تاہم اس کا خیال تھا، رات کا ایک تو ضرور ہی بج رہا ہو گا. دستک دیئے چار پانچ سیکنڈ گزر گئے تو اس نے ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا.... اس بار فوراً ہی انسپکٹر جمشید کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی:

"تم تینوں میں سے دروازے پر کون ہے اور کیا بات

ہے۔ کہیں تم نے کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھ لیا؟"

"ابا جان! یہ میں ہوں۔"

"محمود کیا بات ہے؟"

"دروازہ کھولیے، اس کے بعد ہی کچھ بتا سکوں گا۔"

"اچھا" آواز آئی پھر قدموں کی آواز سنائی دی اور دروازہ کھل گیا۔ دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت اور الجھن کے سائے تیرنے لگے۔

"کیا معاملہ ہے؟" ان کے منہ سے نکلا۔

"آرام سے بیٹھ کر بتائیں گے۔" محمود کی بجائے حملہ آور نے کہا۔ اب اس نے محمود کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے۔ پھر وہ آگے بڑھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر جمشید نے اسے تیز نظروں سے گھورا اور پھر خود بھی ایک کرسی کی طرف بڑھے۔ اتنی دیر میں بیگم جمشید بھی بیدار ہو چکی تھیں اور حیرت زدہ نظروں سے اجنبی کو دیکھ رہی تھیں۔

"پہلے تو اپنے بیٹے سے یہ پوچھ لو کہ تمہارے باقی دو بچے کس حالت میں ہیں۔" اس نے ان دونوں کے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید کا رنگ اڑ گیا۔ بیگم جمشید بھی بوکھلا گئیں۔

"اپنے بیٹے سے پوچھو۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"تم اپنی شامت کو آواز دے رہے ہو..." انسپکٹر جمشید نے غرا کر کہا پھر محمود سے بولے:

"بتاؤ محمود، فاروق اور فرزانہ کو کیا ہوا؟"

محمود نے جلدی جلدی انہیں بتایا کہ فاروق اور فرزانہ کس پوزیشن میں ہیں۔ انسپکٹر جمشید کا چہرہ تن گیا۔ ان کی نظریں اجنبی پر جم گئیں۔ پھر انہوں نے سرد آواز میں کہا:

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"جو میں چاہتا ہوں، اگر تم نے نہ دیا تو اپنے دونوں بچوں کو زندہ نہیں دیکھ سکو گے، ہم مر جانے یا مار دینے کا تہیہ کر کے آئے ...... لیکن اگر تم نے وہ چیز ہمیں دے دی تو تمہارے بچوں کی زندگیاں محفوظ رہیں گی، اب تم فیصلہ کر لو، کیا کرنا ہے۔"

"جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو جاتا کہ تم لوگ کیا چیز حاصل کرنا چاہتے ہو، اس وقت تک میں کچھ نہیں کہہ سکتا، صاف صاف بات کرو۔" انہوں نے رعب میں آئے بغیر کہا۔

"تو پھر سنو! ہمیں اس سرخ فائل کی ضرورت ہے جو اس وقت بھی تمہارے کمرے میں موجود ہے اور مجھے یقین ہے۔ اس سامنے والی الماری میں ہو گی۔" اس نے کہا۔

"کیا!!!" انسپکٹر جمشید کے منہ سے خوف زدہ آواز میں نکلا۔

○

چند لمحوں کے لیے کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ ان کے کیا کہنے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ سرخ فائل کوئی بہت ہی خاص فائل ہے۔ محمود اور بیگم جمشید کو اپنے سانس سینے میں ڈوبتے محسوس ہوئے، کیونکہ یہ معاملہ تھا فاروق اور فرزانہ کی زندگی کا۔۔۔ اس وقت وہ دونوں ان کے رحم و کرم پر تھے۔

"ہاں تو تم نے کیا فیصلہ کیا ہے، اگر میں مزید تین منٹ تک اپنے ساتھیوں کے پاس نہ پہنچا تو ان دونوں کو ختم کر دیا جائے گا۔"

"پہلے یہ بتاؤ، تم کون ہو، تمہارا نام کیا ہے اور اس فائل کی تمہیں کیا ضرورت ہے؟" انسپکٹر جمشید سوچتے ہوئے بولے، وہ اپنے ذہن کو تیزی سے گردش دے رہے تھے تاکہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ کیا کرنا چاہیے۔

"ان تینوں میں سے کسی سوال کا جواب بھی نہیں دیا جا سکتا۔" اس نے کہا۔

"تمہیں فائل دے دی جائے تو تم کیا کرو گے۔"

"ہم تم میں سے کسی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ ہم تمہیں اتنی آسانی سے جانے کی اجازت دے دیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں! ہم جانتے ہیں، تم ہمیں آسانی سے نہیں جانے دو گے، لیکن اس کے باوجود ہم یہاں سے چلے جائیں گے، تم فکر نہ کرو، ہم خوب سوچ سمجھ کر آئے ہیں۔"

"وہ تو میں محسوس کر رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"دیر نہ کرو، تمہارے بچوں کی زندگی کی ضمانت صرف دو منٹ تک دے سکتا ہوں۔"

"اچھا! میں سرخ فائل لائے دیتا ہوں، لیکن یاد رکھو، یہ فائل تمہیں بہت مہنگی پڑے گی، میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔" انہوں نے گویا دھمکی دی۔

"ہم جانتے ہیں، لیکن سب سے پہلے ہمیں سرخ فائل چاہیے پھر جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔"

"بہت بہتر۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اٹھے اور سرخ فائل لا کر اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے دور رہتے ہوئے فائل تھام لی۔ دائیں ہاتھ میں وہ پہلے ہی پستول سنبھال چکا تھا۔

"اب سنو ہمارا پروگرام۔۔۔ تمہیں اگر اپنے دونوں بچوں

کی زندگی عزیز ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے، عزیز ہی ہے، کیونکہ
تم نے ان کی جان بچانے کے لیے ہی تو فائل دے دی
ہے، لہٰذا پہلے اپنی بیوی کے ہاتھ اور پیر رسی سے جکڑ دو،
اس کے بعد اپنے بیٹے کے ساتھ بھی سلوک کرو، پھر میں
تمہارے ہاتھ پیر باندھ دوں گا۔۔۔ اس کے بعد میں اس
کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے چلا جاؤں گا۔ یہاں سے
میں تمہارے بیٹوں کے کمرے میں پہنچوں گا اور ان دونوں
کو بھی باندھ کر ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ کیوں
کیسا پروگرام ہے؟"

"بہت اچھا! لیکن تم اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود
رہے ہو۔" انہوں نے کہا۔

"دیکھا جائے گا، کیا سرخ فائل کے ہاتھ سے نکل جانے
کے بعد تم زندہ رہنا پسند کرو گے۔۔۔ تم اچھی طرح جانتے ہو،
اس فائل میں کیا ہے؟"

"ہاں! میں جانتا ہوں، اس میں کیا ہے، اب یہ میں نے
تمہارے حوالے کر دی ہے۔ لہٰذا تم یہ لے کر چلے جاؤ۔۔۔
رسی تمہارے پاس ہے یا میں اس کا بھی بندوبست کروں؟"
انسپکٹر جمشید غصے کے عالم میں کہتے چلے گئے۔

"ہم ہر چیز ساتھ لے کر آئے ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا

اور ریشم کی ڈوری جیب میں سے نکال کر ان کی طرف اچھال
دی۔ انہوں نے رسی کو دبوچ لیا اور پہلے بیگم جمشید کی طرف
بڑھے، ان کے ہاتھ پشت پر لا کر باندھنے لگے۔

"ڈھیلے نہ باندھنا انسپکٹر جمشید۔ میں پہلے چیک کروں گا اور
پھر یہاں سے جاؤں گا اور جلدی کرو، تین منٹ پورے ہونے
والے ہیں۔"

"فکر نہ کرو، میں ڈنڈی مارنے کا عادی نہیں۔" انہوں نے کہا
اور چند سیکنڈ کے اندر ان دونوں کو جکڑ دیا۔ اس کے بعد اپنے
ہاتھ پشت پر کر کے حملہ آور کی طرف بڑھ گئے۔ اس نے پہلے ان
کے ہاتھ باندھے پھر پیر اور اس کے بعد محمود اور بیگم جمشید کے
بندھے ہوئے ہاتھوں پیروں کو ٹٹولا، پھر تیزی سے مڑا اور یہ کہتے
ہوئے دروازے سے نکل گیا۔

"اچھا انسپکٹر۔۔۔ آج کا دن تمہیں زندگی بھر یاد رہے گا۔"
اس کے ساتھ ہی دروازہ زور دار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

زرد لفافہ

آئی جی صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے ڈاک دیکھ رہے تھے۔ دروازے پر ان کا چپراسی موجود تھا اور ڈاک کے دوران اسے ہدایت تھی کہ کوئی ملاقاتی اندر نہ آنے پائے۔ زرد رنگ کا ایک لفافہ انہوں نے اُٹھایا، اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا، اس پر ٹکٹ نہیں لگے ہوئے تھے، پتے کی جگہ صرف ان کا نام تحریر تھا، انہوں نے گھنٹی بجائی تو چپراسی اندر داخل ہوا:

"یس سر!" اس نے با ادب لہجے میں کہا۔

"یہ لفافہ ڈاک میں کیسے آیا، اس پر ٹکٹ نہیں ہیں۔"

"ایک صاحب دستی دے گئے تھے۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے...." انہوں نے کہا اور لفافہ کھولنے لگے۔ چپراسی پھر باہر جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں آئی جی صاحب لفافے کے اندر سے کاغذ نکال چکے تھے۔ اندر سے سفید کڑکڑاتا کاغذ نکلا تھا اور اس پر چند الفاظ تحریر تھے، انہوں نے وہ الفاظ پڑھے اور پھر ان کی آنکھیں بھنچ گئیں، بھنویں اُبھر آئیں، پیشانی پر بل

پڑ گئے۔ ہاتھ خود بخود گھنٹی کے بٹن کی طرف رینگ گیا۔ چپراسی پھر اندر داخل ہوا... اس نے یس سر کہا، لیکن پھر.... جیسے انہیں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ چپراسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی ہے۔ وہ گہری سوچ میں غرق تھے، آخر چپراسی نے پھر کہا:

"یس سر!"

"اوہ! کریم الدین، انسپکٹر جمشید کو بلا لاؤ، جلدی کرو۔" ان کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

کریم الدین بوکھلا گیا اور تیزی سے نکلا چلا گیا۔ جلد ہی انسپکٹر جمشید اندر داخل ہوئے اور آئی جی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی چونک اُٹھے:

"خیریت تو ہے سر۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"آؤ جمشید بیٹھو...." انہوں نے کہا۔ انسپکٹر جمشید بیٹھ گئے تو وہ بولے:

"جمشید! میں تمہیں اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں، محکمے کا سب سے اہم اور ایمان دار ترین آدمی سمجھتا ہوں، ملک اور قوم کے لیے تمہیں بہت ضروری خیال کرتا ہوں اور تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے بچوں کو بھی، میں نہیں سمجھتا کہ کبھی تم نے مجھ سے کوئی بات چھپائی ہو گی، کیا تمہیں یقین ہے کہ ان دنوں تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہے؟" وہ کہتے

چلے گئے۔ ان کے خاموش ہونے کے بعد بھی چند سیکنڈ تک
انسپکٹر جمشید خاموش رہے، آخر بولے:

"میں اکثر اوقات کچھ باتیں نہیں بتاتا، لیکن وقتی طور پر،
جب تک میں ایک کیس کی تہہ تک نہ پہنچ جاؤں کسی کو بھی
کچھ نہیں بتاتا، یہاں تک کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی نہیں،
وہ اپنے طور پر کچھ اندازے لگا لیں یہ اور بات ہے، آپ کے
ساتھ بھی یہی معاملہ ہے.. میں ہر بات آپ کے علم میں لے
آتا ہوں، لیکن اس وقت جب میں سمجھتا ہوں کہ اب مجھے بتا
دینا چاہیے۔" ان کی آواز میں ٹھہراؤ تھا، گھبراہٹ یا پریشانی نام
کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس پر آئی جی صاحب نے وہ کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا۔
انہوں نے کاغذ لیا اور اس پر لکھی تحریر کو پڑھنے لگے،
لکھا تھا:

آپ کو اپنے ایک ماتحت انسپکٹر جمشید پر بہت
ناز ہے اور شاید اس کے بارے میں آپ یہ خیال
کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ ایمان دار اور وطن
پرست کوئی نہیں، لیکن ذرا اسے بلا کر پوچھیے
کہ گذشتہ رات اس کے گھر میں کیا واقعہ پیش آیا
ہے.... اور یہ کہ اس نے اس واقعے کی رپورٹ کیوں
درج نہیں کرائی، آپ کو کیوں اطلاع نہیں دی۔

اس سے اس کی ایمان داری کا پول کھل جائے گا۔
آپ جو اس پر اتنا زبردست اعتماد کرتے ہیں، وہ
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا... بلائیے اسے؟

خط ختم کر کے انسپکٹر جمشید نے آئی جی صاحب کی طرف
دیکھا، وہ انہی پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سوال
تھا، تجسس تھا، حیرت تھی اور تھوڑا سا رنج بھی تھا۔

"یہ خط پڑھنے کے بعد کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ایماندار
نہیں ہوں، وطن پرست نہیں ہوں اور یہ کہ میں نے کسی بات
کو چھپا کر اپنی کوئی کمزوری چھپائی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابھی تک میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی۔" آئی جی بولے

"تو پھر آپ غمگین کیوں ہو گئے... حیران ہونا تو بجا ہے،
لیکن غمگینی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔"

"نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال ہو رہا ہے کہ تم نے کوئی بات
چھپائی ضرور ہے، ورنہ اس خط کے الفاظ میں اتنا وزن نہ ہوتا۔
جمشید... رات تمہارے گھر میں کیا ہوا تھا؟" آئی جی صاحب نے
عجیب سے لہجے میں کہا۔

"بے شک میں نے یہ بات چھپائی ہے، لیکن اس کی بھی
ایک خاص وجہ ہے۔" آپ یہ کیوں خیال نہیں فرماتے کہ خط
لکھنے والا کیا چاہتا ہے، اسے کس طرح یہ بات معلوم ہو گئی کہ

میرے گھر میں رات کیا ہوا ہے، اس کا مطلب ہے، وہ خود اس معاملے کا ذمہ دار ہے، میرے گھر میں رات جو کچھ ہوا، اسی نے کرایا ہے... کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں!"

"بے شک! میں مانتا ہوں، یہی بات ہے، لیکن تم دیکھ رہے ہو، اس نے خط کے نیچے اپنا نام نہیں لکھا۔" آئی جی بولے۔

"گویا یہ ایک گمنام خط ہے، لکھنے والے نے اپنا نام اور پتا نہیں لکھا تو کیا ہوا، اس کے ہاتھ کی تحریر تو ہمارے قبضے میں آگئی ہے.... لائیے یہ خط مجھے دے دیں۔" انہوں نے کہا۔

آئی جی صاحب نے خط ان کی طرف سرکا دیا، انہوں نے اسے اٹھایا، تہہ کیا اور جیب میں رکھتے ہوئے بولے۔

"کیا اب مجھے اجازت ہے۔"

"کیا مطلب.... تم مجھے اب بھی نہیں بتاؤ گے... رات تمہارے گھر میں کیا ہوا ہے؟" آئی جی صاحب کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"جی! ابھی نہیں... آپ کو چند روز تک انتظار کرنے کی زحمت دوں گا۔"

"لیکن جمشید میں الجھن میں رہوں گا۔" آئی جی صاحب جلدی سے بولے۔

"آپ کسی الجھن کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔... میں خود ہی دیکھ لوں گا۔"

"آخر یہ بتا دینے میں کیا حرج ہے...."

"حرج ہے... ابھی تک میں یہ نہیں جانتا کہ یہ شخص کیا چاہتا ہے۔ جونہی مجھے یہ معلوم ہوا، میں اس کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کر سکا، آپ کو بتا دوں گا۔ ہاں! آپ نے یہ نہیں بتایا، یہ لفافہ آپ تک پہنچا کس طرح، میں دیکھ رہا ہوں، اس پر کوئی ٹکٹ ہے نہ مہر۔"

"ہاں! یہ دستی آیا ہے، کوئی شخص میرے چپراسی کو دے گیا ہے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا پھر وہ آئی جی صاحب کو حیران اور پریشان چھوڑ کر باہر نکل گئے اور کریم الدین سے بولے:

"جو شخص یہ لفافہ دے کر گیا، اس کا حلیہ کیا تھا؟"

"اس کے چہرے پر باریک مونچھیں تھیں، آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ تھا اور نیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا، رنگ صاف تھا، ناک بالکل سیدھی اور ہونٹ پتلے پتلے سرخ رنگ کے تھے، آنکھیں نیلی تھیں اور ٹھوڑی میں گڑھا تھا۔"

چپراسی نے پوری تفصیل سے بتایا۔

"بہت خوب! اگر وہ آدمی تمہارے سامنے لایا جائے تو

تم فوراً اسے پہچان لو گے ؟"

"جی ہاں !" اس نے جلدی سے کہا۔

"بہت خوب !" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ دروازے پر پہنچے تو چپراسی نے دبی آواز میں بتایا :

"اندر ایک ملاقاتی بیٹھا ہے ۔"

"کیا نام ہے اس کا ؟" انسپکٹر جمشید نے بھی آہستہ آواز میں پوچھا۔

"نام تو اس نے بتایا نہیں ، البتہ اس کا حلیہ بہت عجیب ہے ۔" چپراسی بولا۔

"جلدی بتاؤ ۔"

"اس کی آنکھوں پر اندھے شیشوں کی عینک ہے جس نے اس کی آنکھوں کو بالکل چھپا لیا ہے۔ مونچھیں اتنی بڑی بڑی اور گھنی ہیں کہ انہوں نے اوپر کے ہونٹ کو چھپا لیا ہے۔ ہیٹ پیشانی پر جھکا ہوا ہے ۔"

"اوہ ! تب تو معاملہ پُر اسرار لگتا ہے ۔ اچھا کیا اکرام اندر ہے ؟"

"جی نہیں ! انہیں ابھی ابھی ڈی آئی جی صاحب نے بلایا ہے ۔"

"خیر ! تم دروازے پر چوکس بیٹھے رہو ، کان اندر کی باتوں پر لگائے رکھنا ۔"

یہ کہتے ہی انسپکٹر جمشید چک ہٹا کر اندر داخل ہو گئے۔

○

تینوں ابھی تک ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ رات بہت دیر تک پریشان رہنے کی وجہ سے آج وہ سکول نہیں گئے تھے ، یوں بھی انسپکٹر جمشید ان کے ذمے ایک کام لگا گئے تھے۔ بیگم جمشید ناشتے کے برتن اٹھا کر جا چکی تھیں۔

"یار فاروق ! رات تو بہت بڑی ہوئی !" محمود کہہ رہا تھا۔

"کوئی نئی بات نہیں ، مجرم ہمارے ساتھ بڑی کرتے ہی رہتے ہیں۔ بس ذرا یہ ہے کہ رات ان کا منصوبہ اس قدر عجیب اور مضبوط تھا کہ ہم میں سے کسی کا بس نہ چلا اور وہ کامیاب رہے ۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"ابا جان اور میں صرف اس لیے ان کے خلاف کچھ نہ کر سکے کہ ہمیں تم دونوں کا فکر تھا !" محمود نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ کہ تم نے بھی ہمارا فکر کیا !" فرزانہ نے بھی منہ بنا کر کہا۔ "بدلے میں ہم بھی کسی موقعے پر تمہارا اور ابا جان کا فکر کر لیں گے ۔"

"معلوم ہوتا ہے، آج ہم کوئی کام نہیں کریں گے، بس
بیٹھے باتیں بگھارتے رہیں گے۔" محمود نے کہا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے خود تو باتوں میں شریک
ہی نہیں ہو، اور یہ بات بھی آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ
باتیں کیسے بگھاری جا سکتی ہیں، باتیں بھی کوئی دال ہیں۔" فاروق
بول اٹھا۔

"محاوروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر نہ پڑا کرو۔" فرزانہ مسکرائی۔

"لو.... خود بھی جملے میں محاورہ شامل کر دیا۔" محمود نے
گویا ہانک لگائی۔

"چلو محاورہ ہی شامل کیا ہے، کوئی نمک مرچ تو نہیں
لگایا۔" فاروق نے کہا۔

"اور یہ نمک مرچ لگانا بھی تو محاورہ ہے۔" فرزانہ کہاں رکنے
والی تھی۔

"یوں لگتا ہے جیسے ہم تینوں نے مرچیں زیادہ کھا لی
ہیں....." محمود بولا۔

"اگر ہم نے باتوں کا سلسلہ ختم نہ کیا تو دوپہر میز پر ہی
ہو جائے گی۔" فرزانہ نے دونوں کو گھورا۔

"باتوں کا سلسلہ ختم بھی کر دیں گے، تب بھی میز پر تو دوپہر
ہو گی ہی، کیونکہ میز یہیں رہے گی، اور تم ہمیں اس طرح کیوں

گھور رہی ہو جیسے ہم پر افسر لگی ہوئی ہو۔" محمود نے تلملا
کر کہا۔

"اچھا نہیں گھورتی اور اب اٹھو، ہمیں معلوم کرنا ہے، رات
حملہ آور مکان میں کس طرح داخل ہو گئے تھے جب کہ دروازے
اور کھڑکیاں بالکل بند تھے، چھت کا زینہ بھی بند تھا اور ہمارے
مکان کی پچھلی طرف سے کوئی پانی کا پائپ بھی اوپر نہیں آتا۔"
فرزانہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر صاف ظاہر ہے، وہ جادو کے زور سے آئے
ہوں گے، انہوں نے کسی جادوگر کی خدمات حاصل کی ہوں
گی۔" فاروق بول اٹھا۔

"کاش وہ جادوگر سے تمہاری زبان بند کرنے کا منتر بھی پوچھ
آتے اور جاتے جاتے منتر پڑھ جاتے۔" فرزانہ نے برا سا
منہ بنا کر کہا۔

"اس کے لیے انہیں کسی جادوگر کی خدملت حاصل کرنے
کی ضرورت نہیں تھی، یہ منتر تو خود مجھے آتا ہے، لیکن انہوں
نے تو ہمیں بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔" فاروق نے جواب
میں کہا۔

"بہت عقل مند تھے، ورنہ عام طور پر تم مجرموں کو باتوں
میں لگا لیتے ہو۔" محمود مسکرایا۔

"شکریہ! دوسرے لفظوں میں تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں باتیں کرنے کی مشین ہوں۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"مشین تو خیر تم نہیں ہو۔" فرزانہ کے لہجے میں شوخی تھی۔

"تم لوگ ابھی تک میز پر ہی ہو۔" اندر سے بیگم جمشید کی آواز آئی۔

"جی ہاں امی جان! کیا آپ کو ہم سے کوئی کام ہے؟" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"نہیں! لیکن تمہیں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے، تمہارے ابا جان جو کام کہہ گئے ہیں، وہ کیوں نہیں کر لیتے۔" انہوں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک امی جان! ہم ابھی کام شروع کرتے ہیں۔" محمود نے کہا۔

تینوں سب سے پہلے چھت پر آئے... زینے کا دروازہ صبح انہیں جوں کا توں بند ملا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ حملہ آور چھت کے راستے اندر داخل نہیں ہوئے تھے، لیکن اس راستے کے علاوہ ان کے اندر آنے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا، اس لیے چھت کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ انہوں نے ایک ایک انچ کا جائزہ لیا، منڈیروں کو غور سے دیکھا، لیکن کوئی سراغ نہ ملا:

"مجھے یقین سا ہوتا جا رہا ہے، وہ ضرور جادو کے زور سے اندر داخل ہوتے تھے۔" فاروق نے تنگ آکر کہا۔

"سائنس کے دور میں جادو کی بات عجیب سی لگتی ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"عجیب سی لگتی ہو گی، لیکن عزیب نہیں لگتی۔" فاروق نے جواب دیا۔

"توبہ ہے تم سے۔" محمود نے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں جھلا کر کہا، ساتھ ہی ران پر ہاتھ مارا۔

"آؤ نیچے چلیں، یہاں کچھ نہیں ہے۔" محمود نے منہ بنا کر کہا اور تینوں نیچے آئے۔ دروازے سے باہر نکل وہ پائیں باغ کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک آواز نے ان کے پاؤں جکڑ لیے۔

"بھلا ہو بچو۔"

"بہت بہت شکریہ بابا جی——" فاروق نے جلدی سے کہا.... ان کے سامنے ایک بھکاری کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں پر اندھے شیشوں کی عینک تھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا بچو۔" بھکاری گڑبڑا گیا۔

"تو کیا یہ مطلب تھا، بھلا نہ ہو۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"نہیں یہ مطلب بھی نہیں تھا، میں بھکاری ہوں، کچھ خدا

کے نام پر مل جائے۔"

تینوں نے اپنی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے، اس کے ہاتھ میں سکے تھمائے اور پائیں باغ میں داخل ہونے کے لیے مڑ گئے۔ بوڑھا سکوں کے کناروں کو انگلی پھرا کر دیکھ رہا تھا کہ کتنے کتنے پیسے والے سکے ہیں۔

"ہمیں باغ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگانا چاہیے۔" محمود نے کہا۔

"وہ کیوں، اگر دیوار سے ہٹ کر چکر لگائیں گے تو کیا نقصان ہو جائے گا؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"اندر داخل ہونے کے لیے انہوں نے جو راستہ بھی اختیار کیا ہوگا، دیوار کے پاس رہ کر کیا ہوگا۔" اس نے جواب دیا۔

"ہوں۔ بات تو کچھ ٹھیک لگتی ہے۔" فاروق سوچتے ہوئے بولا۔

وہ دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے، ایک ایک قدم پر بغور جائزہ لے رہے تھے، اچانک محمود تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے جھک کر کوئی چیز اٹھا لی۔

دو گڑھے، آدھا بٹن

کمرے میں موجود آدمی انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم..." انسپکٹر جمشید بولے۔

"وعلیکم السلام... کیا آپ ہی انسپکٹر جمشید ہیں؟"

"جی ہاں! آپ کون صاحب ہیں اور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"میرا نام جبار باقر ہے۔ محکمہ اطلاعات میں آفیسر ہوں، آج صبح ایک شخص میرے گھر کے دروازے پر آیا، اس نے دستک دی، میرے ملازم نے دروازہ کھولا تو اس نے بتایا کہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے، اس نے میرا باقاعدہ نام لیا تھا۔ ملازم نے اسے ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا اور مجھے اطلاع دی۔ میں اس جا کر ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ان دنوں مالی الجھنوں میں مبتلا ہے، اگر میں اسے اپنے محکمے میں ملازمت دلا دوں تو وہ بڑا شکر گزار ہوگا۔ یہ سن کر میں جھلا اٹھا، کیونکہ ایسے

نوجوان اکثر آتے رہتے ہیں۔ میں نے سخت لہجے میں کہا کہ کوئی جگہ خالی نہیں ہے، یہ سن کر وہ اٹھا اور چلا گیا۔ میں ڈرائینگ روم سے باہر نکلنے لگا تو نظر میز پر پڑی۔ اس میز پر ایک سرخ رنگ کی فائل پڑی تھی۔"

"کیا!!" انسپکٹر جمشید چونک اٹھے، سنبھل کر بیٹھ گئے۔ آنکھوں میں حیرت کوندنے لگی۔

"جی ہاں! میں سمجھا کہ فائل میں اس کے تعلیم کے سرٹیفکیٹ وغیرہ ہوں گے، فائل اٹھا کر اسے روکنے کے لیے بیرونی دروازے کی طرف لپکا، لیکن اتنی دیر میں وہ جا چکا تھا۔ میں نے فائل ملازم کے حوالے کر دی، تاکہ وہ واپس آئے تو اسے لوٹا دے۔"

"اور آپ نے فائل کھول کر نہیں دیکھی۔" انسپکٹر جمشید نے بے تاب ہو کر کہا۔

"جی نہیں، کھول کر تو تب دیکھتا جب اسے ملازمت دینے کا کوئی امکان ہوتا۔ آج کل تو جگہ کوئی خالی ہے ہی نہیں، لیکن فوراً ہی ملازم دوڑتا ہوا آیا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں گھبرا گیا کہ نہ جانے کیا بات ہے۔ اس نے فائل کھول کر میرے سامنے کر دی۔ فائل میں ایک تصویر لگی تھی، تصویر کے سینے میں ایک خنجر گڑا ہوا تھا اور اس

کے ارد گرد خون پھیلا ہوا دکھایا گیا تھا۔ تصویر کسی نے ہاتھ سے بنائی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے بنانے والا کوئی بہت اچھا کاریگر ہے، میں خود تصویر دیکھ کر لرز گیا اور ملازم کی گھبراہٹ میری سمجھ میں آ گئی، میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ فائل وہ نوجوان بھول گیا ہے اور اس میں اس کے سرٹیفکیٹ ہوں گے، لیکن جب اس میں سرٹیفکیٹ کے بجائے اسے وہ تصویر نظر آئی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا، ظاہر ہے کہ یہ ایک عجیب بات تھی، ایک ایسی تصویر والی فائل ساتھ لیے پھرنا آخر کیا مقصد رکھتا ہے؟" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"بس یا آپ کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا آپ کو یہ سن کر حیرت نہیں ہوئی؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا واسطہ دن رات حیران کن باتوں سے پڑتا رہتا ہے، آپ اس فکر میں نہ پڑیں، یہ بتائیں، آپ خاص طور پر میرے پاس ہی کیوں آئے ہیں، یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ آپ اس کے لیے پریشان ہو جاتے، آرٹسٹ حضرات نہ جانے دن رات کیسی کیسی تصاویر بناتے ہیں، یہ ان کا کام ہے، ہو سکتا ہے، وہ تصویر اس نوجوان نے ہی بنائی ہو، آپ بتا

چکے ہیں، وہ ملازمت تلاش کر رہا تھا، ہو سکتا ہے، بے کاری
کے لمحات میں اس نے تصویر بنا ڈالی ہو، ہو سکتا ہے، وہ
آرٹسٹ بھی ہو، لیکن اسے یہ پیشہ راس نہ آیا ہو، اس کا کام
چل نہ سکا ہو، اس پہلو سے اگر اس معاملے کا جائزہ لیا جائے
تو کوئی عجیب بات نہیں رہ جاتی، اب فرمائیے، آپ کیا کہنا
چاہتے ہیں" وہ کہتے چلے گئے۔

"اس تصویر کے نیچے ایک نام بھی لکھا ہوا تھا" اس نے
ایسے لہجے میں کہا جیسے سوتے میں بولا۔

"اوہ! یہ بات ہوئی، کیا نام تھا وہ؟"

"انسپکٹر جمشید!" اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا!!!" انسپکٹر جمشید چلا اُٹھے۔

"جی ہاں! اسی لیے تو میں آپ کے پاس چلا آیا ہوں،
وہ تصویر سو فیصد آپ کی ہے۔"

"ہوں! اس نوجوان کا حلیہ بتائیے۔" انسپکٹر جمشید نے بے چین
ہو کر پوچھا۔

"اس کے چہرے پر باریک مونچھیں تھیں۔ سنہری فریم کا
چشمہ آنکھوں پر تھا، نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے
تھا، اس کی ٹھوڑی میں گڑھا تھا۔"

"کیا!!!"

انسپکٹر جمشید اچھل کر کھڑے ہو گئے، ان کے چہرے پر
حیرت کے بے پناہ اثرات نظر آنے لگے۔ جبار باقر انہیں
بوکھلائے ہوئے انداز میں دیکھنے لگا۔ اچانک وہ اُٹھ کر
کھڑے ہو گئے۔

○

"معلوم ہوتا ہے، تمہیں کوئی موتی مل گیا۔" فرزانہ نے چونک
کر کہا۔

"موتی کا بچہ کہو، پورا موتی نظر آیا ہوتا تو محمود کی جھپٹنے
کی رفتار اور ہوتی۔" فاروق بولا۔

"اس کا مطلب ہے، تم نے اس کی رفتار نوٹ کر رکھی
ہے۔" فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں! موتی کی بجائے اگر اس وقت اسے ہیرا نظر آیا
ہوتا تو رفتار کچھ اور ہی ہوتی۔" فاروق مسکرایا۔

"گویا تم محمود کی رفتار ماپنے کا آلہ ہو۔" فرزانہ کے لہجے میں
بلا کی شوخی تھی، فاروق کا منہ بن گیا... پھر وہ دونوں محمود کی
طرف متوجہ ہو گئے، کیونکہ اس نے دونوں کی کسی بات کا جواب
نہیں دیا تھا اور یہ ایک عجیب بات تھی، اس سے یہ ظاہر تھا
کہ اسے کوئی کام کی چیز مل گئی ہے۔ آخر اس کے نزدیک،

پہنچ گئے، محمود نے انہیں نزدیک آتے دیکھ کر کوئی چیز مٹھی میں دبا لی، لیکن فرزانہ نے بھانپ لیا:

"ہوں! یہ کیا چھپایا جا رہا ہے؟"

"اس جگہ زمین کو غور سے دیکھو... کیا کچھ نظر آ رہا ہے؟" اس نے فرزانہ کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔

"اس جگہ کی بجائے ہم تمہاری مٹھی کی طرف کیوں نہ دیکھیں؟" فاروق بولا۔

"مٹھی بھی دکھا دوں گا، اس میں اتنی اہم چیز نہیں جتنی زمین پر نظر آنے والی۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"اور اگر اس دوران تم نے مٹھی میں دبی ہوئی چیز غائب کر دی؟" فرزانہ نے بے اعتباری سے کہا۔

"میں اتنا بے ایمان نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔"

"تو پھر کہتے ہو، ہمیں بتا دو، آئندہ اتنا ہی سمجھ لیں گے۔" فاروق بولا۔

"اگر تم دونوں کا موڈ کام کرنے کا نہیں، تو کمرے میں جا کر آرام کرو، میں خود ہی یہ معلوم کر لوں گا کہ حملہ آور مکان میں کس طرح داخل ہوئے تھے۔" محمود نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے، تم ہماری مدد کے بغیر یہ معلوم

نہیں کر سکو گے۔" فرزانہ نے کہا۔

"لیکن میرا یہ خیال نہیں۔" محمود بولا۔

"خیر... ہم کام کے موڈ میں ہیں، اب بتا دو، کیا معاملہ ہے؟"

"دیوار سے کچھ فاصلے پر دو چھوٹے چھوٹے سے گڑھے نظر آ رہے ہیں- یہ ہیں بھی گول۔" محمود نے کہا۔

"تو پھر ان سے کیا ہوتا ہے۔ یہ کسی کے قدموں کے نشانات تو ہو نہیں سکتے۔" فرزانہ بولی۔

"لیکن یہ کسی سیڑھی کے نشانات ضرور ہو سکتے ہیں اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ سیڑھی لگا کر پہلے چھت پر گئے اور پھر انہوں نے سیڑھی اوپر کھینچ کر مکان کے صحن میں رکھی اور اس کے ذریعے نیچے اترے۔" محمود نے کہا۔

"اوہ!" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے، سیڑھی میں کچھ تو وزن ہوتا ہی ہے، آخر ہم میں سے کسی نے سیڑھی کے فرش پر پڑنے یا دیوار کے ساتھ ٹکرانے کی آواز کیوں نہیں سنی؟" فاروق نے اعتراض کیا۔

"ہو سکتا ہے، ہم بہت گہری نیند سو رہے ہوں۔" محمود بولا۔

"بات کچھ دل کو نہیں لگتی، لیکن اس کے علاوہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔" فرزانہ نے کہا۔

"اچھا خیر! اباجان سے بات کریں گے، اب تم مٹھی کھول دو، تاکہ دوسری چیز بھی ہم دیکھ سکیں۔"

محمود نے سر ہلایا اور ہاتھ اُوپر کرتے ہوئے مٹھی کھول دی۔ انہوں نے دیکھا، اس کی ہتھیلی پر ایک ٹوٹا ہوا بٹن تھا۔ آدھا بٹن۔ شاید یہ قمیص میں لگا ہوا تھا، درمیان سے ٹوٹ کر گر گیا تھا، اس کا باقی حصہ قمیص میں ہی لگا رہ گیا ہوگا۔

"نہ جانے کیا بات ہے، یہ آدھا بٹن میرے ذہن میں چبھنے لگا ہے۔" فرزانہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"چبھنے اس لیے لگا ہے کہ ٹوٹنے سے یہ نوکیلا ہو گیا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"یار مذاق نہ کرو، کبھی تو موقع محل دیکھ لیا کرو۔" محمود نے جھنجھلا کر کہا۔

"مجھے تو یہاں دور دور تک کوئی محل دکھائی نہیں دیتا۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا دماغ نہ چاٹو!" محمود نے کہا۔

"مجھے دماغ چاٹنے کا شوق بھی نہیں ہے۔" فاروق نے بھی اسی کے لہجے میں کہا۔

"میری تجویز یہ ہے کہ ان گڑھوں کی بالکل سیدھ میں چھت پر جاکر منڈیر کا جائزہ لیا جائے۔" محمود نے جلدی

سے کہا۔

"جائزہ تو تم ناک کی سیدھ میں جاکر بھی لے سکتے ہو۔" فاروق منمنایا۔

"تم بتاؤ فرزانہ۔۔۔۔ یہ تو یونہی اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہتا ہے۔"

"تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے، ہم چھت پر گئے ضرور تھے، لیکن خاص طور پر اس حصے کو نہیں دیکھا تھا۔" فرزانہ بولی۔

"بہت خوب! تو پھر تم دونوں یہیں ٹھہرو، میں اوپر جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ پائیں باغ سے نکلا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ جلد ہی منڈیر پر نظر آیا۔ اس نے سر کو نیچے جھکا کر دیوار کا جائزہ لیا، دیوار سیمنٹ کی تھی اور اس پر سفیدی بھی تازہ کرائی گئی تھی۔ فوراً ہی انہوں نے محمود کی پُر جوش آواز سنی۔

"میں یہاں بھی وہ گول گول نشان دیکھ رہا ہوں اور اب یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ لوگ سیڑھی کے ذریعے اندر داخل ہوئے تھے۔"

"چلو مان لیا، سوال یہ ہے کہ زینہ تو بند نہیں تھا، پھر وہ نیچے کیسے اُترے۔"

"اسی سیڑھی کے ذریعے، شاید وہ کوئی بہت ہلکی سی سیڑھی تھی۔" محمود نے کہا۔

"اوہ!" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا اور پھر محمود

نیچے اُتر آیا۔ اب انہوں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ حملہ آور اندر
کس طرح داخل ہوئے تھے، لہٰذا اپنے کمرے میں آگئے، ابھی
بیٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔

"لو! کوئی ملاقاتی آگیا۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔" محمود نے کہا اور اٹھ کر دروازے
کی طرف چل پڑا۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہاں ایک نوجوان آدمی کھڑا تھا۔
اس کی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ تھا، نیلا سوٹ پہنے ہوئے
تھا اور ٹھوڑی میں گڑھا تھا۔

محمود کی نظر اس کی قمیص پر پڑی اور پھر وہیں اٹک کر رہ
گئی۔ قمیص کا ایک بٹن آدھا ٹوٹا ہوا تھا۔

پُراسرار ہمدرد

آئی جی صاحب کے فون کی گھنٹی بجی، انہوں نے ریسیور اٹھا
کر کان سے لگا لیا، دوسری طرف سے کسی نے کہا:

"شیخ صاحب! میں آپ کا ایک ہمدرد بول رہا ہوں...!"

آئی جی صاحب نے یہ جملہ سنتے ہی ایک بٹن دبا دیا۔
جب بھی کوئی گمنام آدمی انہیں ٹیلی فون کرنے کی کوشش کرتا
تھا، وہ یہ بٹن دبا دیتے تھے۔ اس بٹن کا تعلق ایک خودکار
آلے سے تھا، وہ آلہ دوسری طرف کے فون کا نمبر ٹائپ کر دیتا
تھا اور اس طرح وہ یہ معلوم کر لیا کرتے تھے کہ دراصل فون کس
نے کیا تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے یہی کیا تھا۔

"میں اپنے ہمدردوں سے مل کر ہمیشہ خوش ہوتا ہوں۔" انہوں
نے کہا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟"

"نام کی بات چھوڑیں اور کام کی بات کریں، میں وہی ہوں
جس نے آج صبح آپ کو ایک لفافہ بھیجا تھا، کیا آپ انسپکٹر
جمشید سے پوچھ چکے ہیں؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"اوہ! تو آپ وہ ہیں۔ کیا آپ میرے دفتر میں آ کر بات نہیں کر سکتے۔" انہوں نے چونک کر کہا۔

"جی نہیں، میں دور دور رہ کر ہی کام کرنے کا عادی ہوں۔ ملک کی خدمت کا مجھے بہت شوق ہے، لیکن سامنے آ کر کام کرنے کا نہیں، میں جانتا ہوں، انسپکٹر جمشید نے آپ کو یہ نہیں بتایا ہو گا کہ رات ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا، لیکن میں آپ کو یہ بات ضرور بتاؤں گا، کیونکہ اس ملک کا سچا ہمدرد تو میں ہوں۔"

"اوہ!" آئی جی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اُن کی آنکھوں میں حیرت دوڑنے لگی۔

"جی ہاں! اب سنیے، رات انسپکٹر جمشید کے گھر میں تین آدمی داخل ہوئے تھے اور وہ ایک سرخ فائل ان سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

"کیا!!!" آئی جی اتنے زور سے چلائے کہ باہر بیٹھا چپراسی بھی گڑبڑا گیا۔ پھر وہ ہیلو ہیلو ہی کرتے رہ گئے، لیکن سلسلہ تو بند ہو گیا تھا۔ انہوں نے جلدی سے ایک بٹن دبایا۔ میز کی دراز میں ایک خانہ ظاہر ہوا اور کاغذ کے پرزے پر نمبر لکھا ہوا نظر آیا، انہوں نے فوراً ٹیلی فون ایکسچینج سے اس نمبر کے بارے میں معلوم کیا، اور پھر ان کی مایوسی کی کوئی حد

نہ رہی، نمبر ایک پبلک فون بوتھ کا تھا۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے دروازے کی گھنٹی بجائی اور چپراسی کے اندر آتے ہی بولے:

"انسپکٹر جمشید کو بلاؤ! جلدی کرو۔"

"جی بہتر!"

چپراسی دوڑا گیا اور پھر واپس آ کر بولا:

"سر! وہ اپنی سیٹ پر نہیں ہیں، ان کے چپراسی نے بتایا ہے، ایک صاحب آئے تھے، ان کے ساتھ گئے ہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا پھر بولے:

"اچھا تو ڈی آئی جی صاحب کو بلا لاؤ۔" ان کی آواز سے تھکن ظاہر تھی۔

خان صاحب اندر داخل ہوئے اور انہیں فکر مند دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

"شاید ہم پر کوئی بڑا وقت آنے والا ہے۔" آئی جی صاحب کے منہ سے نکلا۔

"خیر تو ہے جناب!" خان صاحب نے بوکھلا کر کہا۔

"رات کچھ لوگ انسپکٹر جمشید سے سرخ فائل لے اُڑے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔

"نہیں!" ان کے لہجے میں زمانے بھر کی حیرت اُتر آئی۔

"انسپکٹر جمشید سے وہ فائل حاصل کرنا آسان کام نہیں، کسی نے ضرور افواہ اُڑائی ہے۔"

"لیکن میرا خیال ہے، یہ حقیقت ہے۔" انہوں نے کہا اور پھر تفصیل سے ساری بات انہیں سنائی... خان صاحب کا چہرہ لٹک گیا۔ آخر بولے:

"اس وقت تک کچھ نہیں کہا جا سکتا، جب تک جمشید واپس نہ آجائے اور ہم اس سے بات نہ کرلیں۔"

"تو پھر ہم یہیں موجود رہیں گے... کیوں نہ تمام آفیسرز کو روک لیا جائے... کہ وہ گھر نہ جائیں۔ جمشید کے آنے پر پہلے ہم اس سے بات کریں گے اور پھر ایک میٹنگ کرلیں گے۔"

"نہایت معقول تجویز ہے۔"

انہوں نے ایک کاغذ پر چند لائنیں لکھ کر چپراسی کے حوالے کیں اور کچھ ہدایات دیں، چپراسی چلا گیا۔

"مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ ایسا ہو چکا ہے، جمشید کو اس فائل کی حقیقت سے پوری طرح باخبر کر دیا گیا تھا اور اسی لیے اس کے حوالے کی تھی کہ اس کے پاس محفوظ رہے گی، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس نے فائل دشمنوں کے حوالے کر دی ہو گی، ایسی چیز تو وہ اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی جانیں دے کر بھی دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔"

"میں نے اس سے رات کے واقعے کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے کچھ بتانے سے انکار کیوں کیا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات نہیں تھی تو اسے صاف صاف بتا دینا چاہیے تھا۔"

"اب اس کے آنے پر ہی اصل بات معلوم ہو سکتی ہے، نہ جانے وہ کس کے ساتھ چلا گیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چپراسی واپس آیا، اسے دوبارہ انسپکٹر جمشید کے کمرے کی طرف بھیجا گیا، لیکن اس نے آکر بتایا، وہ ابھی تک واپس نہیں آئے۔

○

انسپکٹر جمشید جبار باقر کے ساتھ اس کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ کوٹھی مختصر سی تھی، لیکن خوب صورت طرز کی بنی ہوئی تھی۔ روش پر چلتے ہوئے انہوں نے پوچھا:

"آپ اندھے شیشوں کا چشمہ کیوں لگائے رکھتے ہیں؟"

"ابھی کچھ ہی دنوں سے لگانا شروع کیا ہے، روشنی میری آنکھوں کو تکلیف دینے لگ گئی ہے، ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تھا، انہوں نے دوا کے ساتھ اندھے شیشوں کا چشمہ بھی لگانے کی ہدایت کی، اس سے اتنا فائدہ ہے کہ اب روشنی تکلیف نہیں دیتی۔" اس نے بتایا۔

"سنہری فریم والا آدمی پہلے تو کبھی ملازمت کے لیے آپ کے پاس نہیں آیا۔"

"جی نہیں!"

کوٹھی کے گراؤنڈ میں انہیں تین بچے کھیلتے نظر آئے۔ ملازم نے باہر نکل کر ان کے لیے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولا۔

"جمعہ خان! وہ فائل لے آؤ۔" جبار باقر نے اپنے ملازم سے کہا۔

"بہت اچھا صاحب!" اس نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

"آپ نے پہلے بھی کبھی سنہری فریم کے چشمے والے کو دیکھا ہے؟"

"جی نہیں! آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔" وہ بولے۔

"بات عجیب ضرور ہے، آخر ایک ایسے نوجوان کے پاس میری تصویر کہاں سے آئی، تصویر بھی ایسی جس کے سینے میں خنجر پیوست ہے!"

"اسی لیے تو میں آپ کے پاس دوڑا گیا تھا۔" جبار توقیر نے کہا۔ "سوال یہ ہے کہ اب آپ کیا کریں گے؟"

"میں.... میں اس نوجوان کو تلاش کروں گا اور اس سے پوچھوں گا، فائل اسے کہاں سے ملی، اس کا فائل سے کیا تعلق ہے!" انہوں نے کہا۔

اسی وقت ملازم اندر داخل ہوا، انسپکٹر جمشید فائل کو دیکھ کر چونک اٹھے، یہ وہی فائل تھی جو رات حملہ آوروں نے اڑائی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر فائل ملازم کے ہاتھ سے لے لی اور اسے کھول کر دیکھا۔

فائل میں سے کاغذات غائب تھے اور اب ان کی تصویر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تصویر کے سینے میں خنجر گڑا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کاغذات نکال لیے گئے تھے اور اس میں ان کی تصویر لگا دی گئی تھی۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ! یہ فائل میں لے جا رہا ہوں اور اگر وہ نوجوان مل گیا تو اس سے پوچھوں گا، فائل اسے کہاں سے ملی تھی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ یہاں جبار توقیر کی کار میں آئے تھے، انہوں نے ڈرائیور کو ساتھ بھیجنے کی پیشکش کی، لیکن انہوں نے منظور نہ کیا اور سڑک کے کنارے کھڑی ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ گئے۔

"ہیرس روڈ، گرین بلڈنگ!" انہوں نے دفتر کا پتا بتایا۔

"او کے سر!" ٹیکسی ڈرائیور نے انجن سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے ذرا جلدی ہے، تیز چلو!" انہوں نے کہا۔

"آج کل دھڑا دھڑ چالان ہو رہے ہیں جناب!"

"فکر نہ کرو، تمہارا چالان نہیں ہوگا۔" وہ بولے۔

"بہت بہتر۔" یہ کہتے ہوئے اس نے رفتار بڑھا دی۔

جبار توقیر کی کوٹھی غیر آباد علاقے میں تھی اور یہاں کافی کافی فاصلے پر کوٹھیاں اور مکان نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید خیالات میں گم ہو گئے۔ ٹیکسی ایک موڑ مڑی تو بھی انہیں احساس نہ ہوا... وہ اسی طرح سوچ میں ڈوبے رہے۔ اچانک ان کی ناک میں ایک تیز بُو گھسی، وہ چونک اُٹھے، انہوں نے فوراً سانس روک لیا، لیکن اتنی دیر میں کچھ بُو اندر جا چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ان کا سر چکرایا اور وہ سیٹ پر لڑھک گئے۔

اس کے ساتھ ہی ٹیکسی ایک کچے راستے پر اُتر گئی۔ دھول اڑنے لگی۔ ہچکولے کھاتی ٹیکسی ایک کھنڈر کے سامنے رُک گئی۔ شاید یہ عمارت کسی زمانے میں کوئی محل تھا۔ اب تک بڑے بڑے ستون کھڑے تھے اور ان پر نقش و نگار صاف نظر آ رہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہارن دیا تو کھنڈر میں سے دو آدمی باہر نکلے۔ ان میں سے ایک نے فوراً کہا:

"کیا تم اسے لے آئے؟"

"ہاں! لے آیا۔" وہ بولا۔

"بہت خوب!" دونوں آگے بڑھے، پھر تینوں نے مل کر انسپکٹر جمشید کو اٹھایا اور کھنڈر کے اندر لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ انہیں ایک ستون کے ساتھ باندھ رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، کھنڈر سے باہر نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ راستہ تنگ تھا اور اس کے دونوں طرف جھاڑیاں تھیں، اس لیے گاڑی کو موڑا نہیں جا سکتا تھا چنانچہ گاڑی اُلٹی چلنے لگی۔ سڑک پر پہنچتے ہی اُس کا رُخ شہر کی طرف ہو گیا اور پھر وہ پوری رفتار سے اڑنے لگی۔

نوجوان آگیا

"فرمایئے! آپ کو کس سے ملنا ہے؟" محمود نے پوچھا۔
"انسپکٹر جمشید یہیں رہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"کیوں! کیا آپ کو یہ بات پہلے ہی معلوم نہیں؟" محمود نے اسے چبھتی نظروں سے دیکھا۔
"جی ـــــ کیا مطلب؟" وہ چونکا۔
"میرا خیال ہے، آپ کو یہ بات بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں انسپکٹر جمشید رہتے ہیں۔" محمود بولا۔
اتنی دیر میں فاروق اور فرزانہ بھی وہاں آگئے تھے۔
"جی نہیں، مجھے یہ بات ہرگز معلوم نہیں، لیکن میرے ساتھ کچھ عجیب سا معاملہ پیش آیا ہے، اس لیے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"افسوس! وہ اس وقت اپنے دفتر میں ہیں اور ان سے ملنے کے لیے آپ کو وہیں جانا پڑے گا۔" محمود نے کہا۔
"وہ کس چیز کے انسپکٹر ہیں، کہاں کام کرتے ہیں؟" اُس نے پوچھا۔
"جب آپ کو یہ تک معلوم نہیں تو پھر آپ ان سے ملنا کیوں چاہتے ہیں۔" فاروق نے اسے عجیب سی نظروں سے گھورا۔
"پہلے یہ بتایئے، وہ کس چیز کے انسپکٹر ہیں۔" اس نے بے چین ہو کر کہا۔
"وہ محکمہ سراغرسانی میں انسپکٹر ہیں۔"
"اوہ!" وہ دھک سے رہ گیا، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، تینوں اسے عجیب سی نظروں سے گھور رہے تھے، آخر وہ بولا۔
"شاید میں کسی اُلجھن میں مبتلا ہونے والا ہوں۔"
"آخر بات کیا ہے، صاف صاف کہیے۔"
"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ فون کر کے انہیں یہاں بلا لیں اور میں ساری بات انہیں بتا دوں۔"
"ہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس سے پہلے آپ کو ساری بات ہمیں بتانی ہو گی، آیئے ہم اندر چل کر بیٹھ جائیں۔"
"یہ ٹھیک رہے گا۔" اس نے سکون کا سانس لیا۔
چاروں ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے اور اس نے کہنا

شروع کیا۔

"یہ آج صبح کی بات ہے، میں گھر سے ملازمت کی تلاش
میں نکلا، یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں تقریباً چھ ماہ سے بے کار
پھر رہا ہوں اور ہر روز صبح کو روزگار کی تلاش میں نکلتا
ہوں، سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے روک لیا،
اس نے کہا کہ اگر میں اس کا ایک کام کر دوں تو وہ مجھے
سو روپے دے گا، میں نے کام کے بارے میں پوچھا تو
اس نے ایک لفافہ مجھے دیا اور کہا کہ سامنے محکمہ سراغ رسانی
کی عمارت ہے، وہاں آئی جی صاحب کے دفتر کے دروازے
پر چپراسی بیٹھا ہو گا، یہ لفافہ اسے دے کر آنا ہے اور اتنے
سے کام کے وہ مجھے سو روپے دے گا، مجھے بہت حیرت
ہوئی، خیر میں نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا، اس
نے مجھے سو روپے نہیں دیے، یہ کہا کہ پہلے لفافہ دے آؤں،
پھر سو روپے ملیں گے اور یہ کہ وہ اسی جگہ ملے گا، میں سمجھ
گیا کہ جب لفافہ دے کر واپس آؤں گا تو وہ اس جگہ سے جا چکا
ہو گا، لیکن اس کام میں مشکل تو کوئی تھی نہیں، چنانچہ میں نے
لفافہ لیا اور محکمہ سراغ رسانی کی عمارت میں داخل ہو گیا، آئی جی
صاحب کے چپراسی کو لفافہ دیا اور باہر نکل آیا، یہ دیکھ کر مجھے حیرت
ہوئی کہ وہ وہیں موجود تھا، اس نے سو روپے کا نوٹ میری

طرف بڑھا دیا۔ میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، چلنے کے لیے
قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس نے کہا، اگر تم میرا ایک ایسا ہی کام
اور کر دو تو سو روپے اور ملیں گے۔ بھلا مجھے کیا اعتراض
ہو سکتا تھا۔ میں نے رضا مندی ظاہر کی تو اس نے کہا کہ مجھے کچھ
دور تک اس کے ساتھ چلنا ہو گا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔
آخر وہ ایک جگہ رک گیا، اس نے ایک سرخ رنگ کی فائل
مجھے دی، ایک گھر کا پتا دیا اور کہا کہ فائل اس گھر تک پہنچا
دوں۔ جیب میں سے کاغذ نکالا، پتا پڑھا اور اس وقت مجھے یہ معلوم
ہوا کہ فائل میرے ہاتھ میں نہیں ہے، دراصل میں نے وہ
فائل اپنے سرٹیفکیٹ والی فائل کے ساتھ ہی رکھ لی تھی اور
ملازمت کی تلاش کے دوران کسی جگہ بھول آیا، پتا انسپکٹر جمشید
کا تھا، میں ان جگہوں پر واپس گیا، فائل کے بارے میں پوچھ
گچھ کی، لیکن کچھ پتا نہ چلا، اب یہی سوچ کر یہاں آیا ہوں
کہ کم از کم ان صاحب کو یہ تو بتا دوں کہ ان کی جو امانت مجھے
ان تک پہنچانی تھی، وہ میں گم کر بیٹھا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، تینوں سوچ میں گم ہو گئے۔ فاروق
اور فرزانہ بھی اس کی قمیص کے ٹوٹے ہوئے بٹن کو دیکھ رہے تھے۔

"وہ شخص آپ کو کس وقت ملا تھا؟" محمود نے سوال کیا۔

"صبح سویرے شاید نو بجے ہوں گے۔"

"اور اس وقت گیارہ بجے ہیں، یعنی صرف دو گھنٹے پہلے
اب یہ بتائیے کہ آپ کی قمیص کا یہ بٹن کب کا ٹوٹا ہوا ہے؟" اچانک
فرزانہ نے سوال کیا۔

"جی قمیص کا بٹن... کیا مطلب؟" اس نے حیرت زدہ لہجے میں
کہا، ساتھ ہی اس نے اپنی قمیص کے بٹنوں کی طرف دیکھا۔
اس کا منہ مارے حیرت کے کھل گیا۔

"میری قمیص کا بٹن بے شک ٹوٹا ہوا ہے، لیکن آپ نے
آخر بٹن کے بارے میں کیوں پوچھا؟"

"اس لیے کہ اس کا آدھا حصہ ہمارے پاس ہے اور اگر
آپ اس وقت سے پہلے کبھی یہاں ہمارے گھر یا گھر کے باہر
تک نہیں آئے تو آپ کی قمیص کا بٹن یہاں کس طرح پہنچ
گیا؟" یہ کہتے ہوئے محمود نے بٹن کا ٹکڑا جیب سے نکال کر میز
پر اس کے آگے رکھ دیا۔

اس کی آنکھیں مارے حیرت اور خوف کے کھلی کی کھلی
رہ گئیں۔ بہت دیر گزر گئی مگر اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ
نکل سکا، آخر فاروق نے کہا:

"اور اس بٹن کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ
آپ کی کہانی بالکل جھوٹ ہے، آپ رات بھی یہاں آئے
تھے، اس وقت آپ کے ساتھ دو آدمی اور تھے، آپ

ہمارے گھر میں داخل ہوئے تھے اور زبردستی وہ سرخ فائل
ہم سے حاصل کی تھی، لہٰذا اب آپ یہاں سے جا نہیں
سکتے، محمود ابا جان کو فون کر دو... ان کا یہاں پہنچنا بہت
ضروری ہے۔"

"یہ.... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس نے خوف زدہ لہجے
میں کہا۔

"بتانے کی ضرورت نہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ رات یہاں
کیا ہوا تھا۔ محمود تم نے فون نہیں کیا؟" فاروق نے تیز لہجے میں
کہا۔ محمود نے فرزانہ کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو، کیوں فرزانہ
کیا خیال ہے، فاروق کی تجویز پر عمل کرنا چاہیے یا نہیں۔ فرزانہ
نے سر ہلا دیا اور بولی:

"ان حالات میں ہم اس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اگر ان
کی قمیص کا بٹن ٹوٹا ہوا نہ ہوتا اور اس کا آدھا حصہ ہمیں ان
گڑھوں کے پاس نہ ملا ہوتا تو ہم ان پر ہرگز شک نہ کرتے۔"

"لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ ہمارے پاس بٹن کا جو حصہ ہے
وہ اسی بٹن سے الگ ہوا ہو۔" محمود نے اعتراض کیا۔

"یہ تو ابھی معلوم کیا جا سکتا ہے، کیوں جناب... کیا آپ
اجازت دیں گے کہ یہ دونوں ٹکڑے ملا کر دیکھ لیے جائیں؟"

"ہاں! مجھے کوئی اعتراض نہیں؟" اس نے ایسی آواز میں

کہا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔

فاروق نے اُٹھ کر دونوں ٹکڑوں کو ملا کر دیکھا، دونوں ایک دوسرے پر بالکل فٹ بیٹھ گئے۔

"اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ رات والے حملہ آوروں میں یہ بھی شامل تھے یا یہ باہر کھڑے رہے ہوں گے۔" فاروق نے کہا اور اس ساتھ ہی محمود نے دفتر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

نوجوان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے بوکھلا کر کہا:

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آخر رات یہاں کیا ہوا تھا؟"

"فاروق... انہیں بتا دو کہ رات یہاں کیا ہوا تھا۔" فرزانہ نے کہا۔

فاروق اسے مختصر طور پر بتانے لگا۔ دوسری طرف محمود ہیلو ہیلو کر رہا تھا اور پھر سلسلہ مل گیا دوسری طرف سے بابا فاضل کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو محمود بیٹے... تمہارے ابا جان دفتر میں نہیں ہیں، وہ کسی ملاقاتی کے ساتھ کہیں گئے ہیں، آئی جی صاحب بھی ان کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اوہ!" محمود نے ریسیور رکھ دیا۔ اتنی دیر میں فاروق نوجوان کو تفصیل بتا چکا تھا اور یہ سننے کے بعد کہ رات حملہ آور

سرخ رنگ کی ایک فائل لے اڑے ہیں، اس کی حالت ایک دم خراب ہو گئی تھی، انہیں یوں لگا جیسے وہ برسوں کا بیمار ہو۔

معاملہ ہر لمحے پُر اسرار ہوتا جا رہا تھا، اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

○

وقت گزرتا چلا گیا، لیکن انسپکٹر جمشید واپس نہ لوٹے، آئی جی اور ڈی آئی جی صاحبان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، انہوں نے کئی بار چپراسی کو بھیج کر معلوم کرایا، ان کے چپراسی اور اکرام کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ جونہی انسپکٹر جمشید واپس آئیں، ان کے کمرے میں بھیج دیا جائے، لیکن پھر کافی دیر گزر گئی، آخر انہوں نے چپراسی کو بلوایا۔

"ملاقاتی جس کے ساتھ انسپکٹر جمشید گئے ہیں، کون تھا؟" آئی جی نے اس سے پوچھا۔

"اس نے اپنا نام جبار باقر بتایا تھا اور یہ کہ وہ محکمہ اطلاعات میں ملازم ہے۔" چپراسی نے بتایا۔

"وہ اس کے ساتھ کیوں گئے ہیں، بتا سکتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں! میں نے ان کی گفتگو سنی تھی، کوئی نوجوان جبار باقر کے گھر ملازمت کی خواہش لے کر آیا تھا، جاتے ہوئے وہ وہاں ایک سُرخ فائل چھوڑ گیا۔"

"کیا!!!" آئی جی اور ڈپٹی آئی جی صاحبان ایک ساتھ چلائے۔

"جی ہاں! اس فائل میں جبار باقر کو انسپکٹر صاحب کی ایک تصویر نظر آئی، تصویر کے سینے میں خنجر پیوست دکھایا گیا تھا، یہ تصویر جبار باقر کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی اور وہ یہاں دوڑا آیا، فائل کا ذکر سن کر انسپکٹر صاحب اس کے ساتھ چلے گئے اور اب تک لوٹ کر نہیں آئے۔"

"اُف خدا — یہ کیا چکر ہے۔" ڈی آئی جی صاحب کے منہ سے نکلا۔

"کیوں نہ ہم دفتر اطلاعات کو فون کر کے جبار باقر کے گھر کا پتا معلوم کریں اور پھر وہاں فون کر کے انسپکٹر جمشید سے بات کریں۔" آئی جی صاحب نے تجویز پیش کی۔

"نہایت معقول تجویز ہے۔" ڈی آئی جی بولے۔

ایسا ہی کیا گیا، لیکن دوسری طرف سے جبار باقر نے بتایا کہ انسپکٹر جمشید تو کافی دیر پہلے وہ فائل لے کر جا چکے ہیں۔"

"تب پھر وہ کہاں چلے گئے؟" آئی جی صاحب نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے کیا معاملہ ہے۔ گھر بھی فون کر کے دیکھ لینا چاہیے۔"

انسپکٹر جمشید کے گھر فون کیا گیا، ادھر سے محمود نے بتایا کہ اس کے والد ابھی تک گھر نہیں پہنچے اور یہ کہ وہ خود بھی ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ آئی جی صاحب نے جھلا کر ریسیور رکھ دیا اور بولے:

"تمام آفیسرز کو بلا لیا جائے، ہم میٹنگ کریں گے، معاملہ حد درجے خطرناک ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ان کے کمرے میں سب موجود تھے۔ اکرام کو بھی بلایا گیا تھا۔ پھر آئی جی صاحب نے کہنا شروع کیا:

"اس وقت آپ سب کو بے حد اہم معاملے پر بات چیت کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ چند روز پہلے انسپکٹر جمشید کو ایک سُرخ رنگ کی فائل سونپی گئی تھی، اس فائل کی اہمیت سے بھی انہیں اچھی طرح باخبر کر دیا گیا تھا، فائل حفاظت کے خیال سے ہی ان کے حوالے کی گئی تھی، کیوں کہ دفتر میں اس کی حفاظت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی... ہو سکتا ہے، ہم میں سے کوئی غیر ملکی جاسوس ہو، کچھ کہا نہیں جا سکتا، یہی سوچ کر فائل ان کے حوالے کر دی گئی۔ آج صبح سویرے مجھے ایک لفافہ ملا، اس میں ایک کاغذ پہ لکھا تھا کہ انسپکٹر جمشید سے پوچھا جائے رات اس کے گھر میں کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ میں نے انہیں

بلایا، لیکن انہوں نے کچھ نہ بتایا، پھر مجھے ایک گمنام آدمی کا
فون ملا، اس نے بتایا کہ انسپکٹر جمشید سے رات کچھ نامعلوم آدمیوں
نے وہ سرخ فائل حاصل کر لی ہے۔ اب وہ غائب ہیں، ہم
ان سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فائل انہوں نے دشمن کے
حوالے کیوں کی۔ جب کہ وہ ایک ایسی فائل ہے جس پر کئی انسانی
جانوں کا دار و مدار ہے۔ انہیں تو اپنی جان پر کھیل کر بھی
فائل کی حفاظت کرنی چاہیے تھی، لیکن وہ خود تو بخیریت
پھر رہے ہیں اور فائل دشمنوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔
اس وقت تک انسپکٹر جمشید ایک ایسے آدمی ثابت ہوتے
رہے ہیں جنہوں نے ملک اور قوم کے لیے وہ سب کچھ کیا
جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا، پھر آخر اس مرتبہ کیا بات
ہو گئی کہ انہوں نے فائل ان کے حوالے کر دی اور اس
وقت ان کا کوئی پتا نہیں کہ کہاں ہیں... اگر وہ اور تھوڑی
دیر تک نہ آ گئے تو ہمیں ان کی تلاش کے سلسلے میں کچھ
کرنا پڑے گا...“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ چند لمحے
تک کمرے میں موت کی سی خاموشی چھائی رہی پھر
ڈی آئی جی بولے:

”انسپکٹر جمشید ہمیں اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں، ہم
سوچ بھی نہیں سکتے کہ انہوں نے فائل آسانی سے دشمنوں
کے حوالے کر دی ہوگی، وہ ضرور مجبور ہو گئے ہوں گے۔“

”لیکن ان کی مجبوری کو معاف نہیں کیا جا سکتا، ابھی تک
راصل آپ لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اس فائل میں کیا تھا، وہ مجھے
وزیر خارجہ کی طرف سے ملی تھی۔ لہٰذا فائل کے بارے میں وزیر خارجہ،
یرے اور انسپکٹر جمشید کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اسی
ے آپ لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس حد تک اہم ہو گی۔
ان سے جواب طلب کیا جائے گا کہ انہوں نے فائل دشمنوں کے
والے کیوں کی، اگر وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو مجھے افسوس
ے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔“

کمرے میں موجود لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ شاید اس
ے زیادہ عجیب بات انہوں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں
ئی تھی۔

اکرام کو تو یوں لگا جیسے ابھی اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

انسپکٹر جمشید کو سزا

"کس کا فون تھا؟" فرزانہ نے جلدی سے پوچھا۔

"آئی جی صاحب کا... ابا جان کے متعلق پوچھ رہے تھے، انہوں نے کہا ہے کہ وہ جس وقت بھی گھر آئیں، انہیں دفتر بھیج دیا جائے۔" محمود نے فکر مند لہجے میں بتایا۔

"چاہے وہ رات کے بارہ بجے ہی کیوں نہ آئیں۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"انہوں نے یہ نہیں کہا۔" محمود نے بُرا سا منہ بنایا۔

"خیر! اب ہم کیا کریں۔" فرزانہ جلدی سے بولی۔

"آپ کا نام کیا ہے جناب؟" محمود نے اس کے حلیے کی طرف دھیان دیئے بغیر نوجوان سے پوچھا۔

"مجھے نزاکت رفیق کہتے ہیں۔"

"اپنے بارے میں سب کچھ بتا ڈالیں، آپ کہاں رہتے ہیں، پہلے کہاں ملازمت کرتے تھے، ملازمت سے جواب کیوں ملا؟" محمود نے اس سے کہا۔

"میں شام نگر کی گلی نمبر ۱۳ کے مکان نمبر ۹ میں رہتا ہوں، پہلے میونسپل کارپوریشن میں ملازم تھا، وہاں رشوت کا دور دورہ ہے، میں نے رشوت کو ہاتھ بھی نہ لگایا، اس طرح مجھ سے نیچے والے بھی اور اوپر والے بھی تنگ آگئے، میرے خلاف ایک جھوٹا کیس بنایا گیا اور پھر سزا کے طور پر ملازمت سے نکال دیا گیا، اب در در مارا مارا پھر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"آپ کافی دکھی ہیں، آج کل ایمان دار آدمیوں کی یہی مصیبت ہے، کیا آپ کے گھر میں یا آس پاس کسی کے فون موجود ہے؟ دراصل ہم فون کر کے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آیا آپ واقعی اس جگہ رہتے ہیں، تاکہ بعد میں آپ سے کچھ معلوم کرنا ہو تو وہاں آپ سے ملاقات ہو سکے۔"

"میرے گھر میں فون کہاں... ہاں دو گھر چھوڑ کر ایک سیٹھ ہاشم صاحب رہتے ہیں، میں ان کے پاس بھی ملازمت کے لیے گیا تھا، انہیں یہ معلوم ہے کہ میں ان کا پڑوسی ہوں۔"

"بہت خوب! ان کا نمبر بتلایئے۔" محمود نے کہا، اس نے نمبر بتا دیا۔ نمبر ڈائیل کرنے پر ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"کیا یہ سیٹھ ہاشم کا گھر ہے؟"

"جی ہاں! آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"سیٹھ صاحب گھر ہیں۔"

"جی نہیں، اپنے دفتر گئے ہیں۔"

"بہت خوب! کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ سے دو گھر چھوڑ کر نزاکت رفیق نامی ایک نوجوان رہتا ہے یا نہیں۔"

"وہی تو نہیں جو سنہری فریم کی عینک لگاتا ہے۔" لڑکی نے جلدی سے کہا۔

"جی ہاں وہی۔" محمود بولا۔

"رہتا ہے، کیا آپ اسے فون پر بلانا چاہتے ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔

"جی نہیں شکریہ! اتنا ہی معلوم کرنا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور فاروق اور فرزانہ کی طرف مڑا۔

"ان کے پتے کی تصدیق ہو گئی ہے، کیا خیال ہے، انہیں جانے دیا جائے۔" محمود نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ضرورت پڑی تو ہم ان سے رابطہ قائم کر لیں گے۔" فرزانہ نے کہا۔

"آپ کل شام کے وقت اگر آ جائیں، تو ہمارے ابا جان آپ کو ملازمت دلانے کے سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"بہت بہت شکریہ! میں ضرور آؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے

وہ اٹھ کھڑا ہوا، اچانک فرزانہ بولی۔

"ذرا ٹھہریے... ہم ایک بات تو بالکل ہی بھول گئے اور وہ ہے آدھا بٹن... اگر آپ کی کہانی درست ہے تو آدھا بٹن یہاں کس طرح پایا جا سکتا ہے۔"

وہ چلتے چلتے رک گیا اور ان کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"یہ بات خود میری سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ بٹن یہاں کس طرح رہ گیا ہے، بہر حال آپ کو مجھ پر شک ہے تو میں آپ کے والد صاحب کے آنے تک یہیں رک جاتا ہوں۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"نہیں! آپ جا سکتے ہیں، ہم اس معاملے پر غور کریں گے۔" فرزانہ نے کہا اور وہ ڈرائنگ روم سے نکل گیا، محمود اسے دروازے تک رخصت کرنے آیا اور پھر دروازہ بند کر کے واپس ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑا، اچانک ایک فائر کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

وہ بری طرح چونکے، فاروق اور فرزانہ دوڑ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے، دوسری طرف بیگم جمشید اپنے کمرے سے گھبرائی ہوئی نکلیں۔

"یہ... یہ فائر کی آواز کہاں سے آئی ہے۔"

"گھر کے باہر سے۔" محمود گویا خواب میں بڑبڑایا۔

وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے، پھر جونہی دروازہ
کھول کر باہر نکلے، ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی
کی پھٹی رہ گئیں۔

نزاکت رفیق ان کے دروازے کے باہر پڑا تڑپ رہا
تھا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساکت ہو گیا، آس پاس کی
کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے، بیگم شیرازی بھی باہر آگئیں
محمود پولیس کو فون کرنے دوڑا، عین اسی وقت ایک دھماکا ہوا
اور چاروں طرف دھواں پھیل گیا۔

○

انسپکٹر جمشید کو ہوش آیا تو انہوں نے خود کو ایک
کمرے میں بند پایا، وہ کمرے کے کچے فرش پر پڑے تھے
اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی، لیکن وہ باہر سے بند
تھا، انہوں نے سر کو جھٹک کر واقعات کو یاد کرنے کی
کوشش کی، فوراً ہی انہیں سب کچھ یاد آگیا، وہ جبار باقر
کے گھر سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے تھے اور ٹیکسی میں انہوں
نے تیز بو محسوس کی تھی، پھر وہ بے ہوش ہو گئے تھے، انہوں
نے جلدی سے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی، ساڑھے تین بج رہے تھے
دفتر بند ہونے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا اور ان کا دفتر

پہنچنا بہت ضروری تھا، انہوں نے دروازے کی مضبوطی کا اندازہ
لگایا اور پھر اسے ٹکر مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دروازے سے
دور ہٹتے ہوئے وہ دیوار تک آئے اور پھر تیزی سے دوڑتے
ہوئے دروازے سے ٹکرائے۔ دروازہ چوکھٹ سے اکھڑ کر دوسری
طرف گرا اور وہ باہر نکل آئے، اسی وقت تین کتے غراتے
ہوئے ان کی طرف جھپٹے... انہوں نے ایک لمبی چھلانگ لگائی
اور پھر دوڑتے چلے گئے مگر کتوں نے پیچھا نہ چھوڑا، انہوں نے
پیٹی میں سے پستول نکالنا چاہا، لیکن پستول وہاں نہیں تھا۔ دوسری
طرف کتے برابر ان کا پیچھا کر رہے تھے اور ان کی رفتار انتہائی
تیز تھی، وہ ان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھے، انہوں نے
سوچا، کتوں سے پیچھا چھڑائے بغیر بھاگتے رہنا مناسب نہیں،
یہ سوچتے ہی بھاگتے بھاگتے انہوں نے ایک چھلانگ لگائی اور
راستے سے بائیں طرف ہو گئے، کتے سیدھے نکلتے چلے گئے، لیکن
انہیں آگے نہ پاکر فوراً پلٹے، اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید ان سے
مقابلے کے لیے تیار ہو چکے تھے، تینوں کتے ایک ساتھ
ان پر آئے، لیکن انہوں نے پھرتی سے جھکائی دی اور ایک
کتے کے اپنے جوتے کی نوک اس زور سے رسید کی کہ وہ
بہت دور تک لڑھکتا چلا گیا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ دوسرے دو
خوفناک انداز میں غرائے اور پھر حملہ آور ہوئے، انہوں نے

پھر ایک پر چھلانگ لگائی تو اس کے منہ سے جوتے کی نوک
ٹکرائی اور اس کا جبڑا ہل گیا، وہ چیختا چلاتا ایک طرف کو
بھاگ نکلا۔ اب مقابلے میں صرف ایک رہ گیا تھا۔ انہوں نے
اپنا رُخ تبدیل کیا۔ کتا سیدھا ان کی طرف آیا، وہ ایک
پاؤں پر گھومے اور جھک کر کتے کی پچھلی ایک ٹانگ پکڑ کر
اسے فضا میں اچھال دیا، کتا اونچا اُٹھتا چلا گیا، پھر جونہی
وہ نیچے آیا، انہوں نے فٹ بال کی طرح اس پر ہٹ لگائی
کتے کے منہ سے درد ناک چیاؤں چیاؤں نکلی اور نیچے گرتے
ہی وہ بے حس ہو گیا۔

اس لڑائی میں ان کے تین منٹ اور ضائع ہو گئے تھے
اور وہ نہیں جانتے تھے کہ شہر سے کتنی دور ہیں۔ آخر وہ
دوڑنے لگے۔ پانچ منٹ تک دوڑتے رہنے کے بعد انہیں
سڑک دکھائی دی، لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ شہر کس
طرف ہے، انہیں کم از کم ایک سنگِ میل تک جانا پڑتا
اور تب معلوم ہوتا کہ شہر کس طرف ہے۔ وہ تیزی سے
دوڑنے لگے۔ پہلا سنگِ میل آیا تو انہیں معلوم ہوا، وہ شہر
کی طرف ہی دوڑ رہے ہیں اور سات میل دُور ہیں۔ گویا
انہیں سات میل دوڑنا تھا
وہ دوڑتے رہے، اچانک دوسری طرف سے انہیں ایک

ٹرک کی آواز آئی... وہ مُڑ کر ٹرک کو دیکھنے لگے اور اسے
رُکنے کا اشارہ کیا۔ ٹرک ان کے قریب آکر رُک گیا۔ انہوں
نے جلدی جلدی اسے صورتِ حال بتائی اور وہ انہیں لفٹ
دینے پر رضا مند ہو گیا۔ وہ اچک کر ٹرک پر سوار ہو گئے۔

ٹھیک چار بجے وہ دفتر میں داخل ہو رہے تھے، ان کا
حلیہ بہت بگڑا ہوا تھا، کپڑے گرد آلود ہو گئے تھے اور
کئی جگہ سے پھٹ بھی گئے تھے۔ سردی کے باوجود ان کی
پیشانی پر پسینہ تھا اور چہرے کا رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔
بابا فاضل نے انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور پھر اس
نے بتایا کہ آئی جی صاحب کے کمرے میں سب ان کا انتظار
کر رہے ہیں۔

وہ اسی حالت میں آئی جی صاحب کے کمرے کی طرف
چل پڑے۔ ان کے چپراسی کی نظر انسپکٹر جمشید پر پڑی تو
وہ بھی دھک سے رہ گیا اور فوراً ہانک لگائی:

"انسپکٹر صاحب آگئے ہیں"

آئی جی صاحب کے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سب
لوگ دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ انسپکٹر جمشید اندر داخل
ہوئے تو ان کے منہ حیرت سے کھل گئے۔

"میرے بچے! یہ کیا ہوا؟" ڈی آئی جی کے منہ سے درد

بھری آواز میں نکلا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک کرسی میں گر گئے۔

اس کے بعد انہوں نے جو کچھ ان پر گزری تھی، کہہ سنائی۔ اس میں سُرخ فائل کا ذکر بھی شامل تھا۔ البتہ انہوں نے تفصیل نہیں بتائی کہ فائل حملہ آوروں نے کس طرح حاصل کی تھی۔

"صبح جب میں نے رات کے واقعے کے بارے میں پوچھا تو تم نے کیوں نہیں بتایا تھا؟" آئی جی صاحب نے سوال کیا۔

"میں مجرموں کے اگلے اقدام کے بارے میں جائزہ لینا چاہتا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"تم نے فائل کن حالات میں مجرموں کے حوالے کی؟" انہوں نے پوچھا۔

"ان حالات میں کہ فاروق اور فرزانہ کی گردنوں پر خنجروں کی نوکیں رکھی تھیں۔" انہوں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، تم نے ان کی جان بچانے کے لیے فائل دشمنوں کے حوالے کر دی، حالانکہ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ فائل کس قدر اہم ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ان حالات میں، میں کر بھی کیا سکتا تھا۔" انسپکٹر جمشید بے چارگی سے بولے۔

"تمہارے تینوں بچوں اور بیوی کی جان بھی چلی جاتی، فائل تمہیں تب بھی ان کے حوالے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تم نے ملک کو ایک اتنے بڑے خطرے سے دو چار کر دیا ہے کہ جس کے بارے میں سوچ کر ہی کپکپی آ جاتی ہے۔ تمہارے کارنامے سنہری لفظوں سے لکھنے کے قابل ہے، لیکن اس واقعے نے ان سب پر پانی پھیر دیا ہے، تم خود اپنے لیے سزا تجویز کرو گے یا میں تمہیں سزا سناؤں؟"

کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ آج اس انسپکٹر جمشید کو سزا دی جا رہی تھی جس نے اس ملک اور قوم کے لیے نہ جانے کتنے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اور جن کے بچوں نے ہمیشہ اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر کارنامے کیے تھے، ملک دشمنوں کو تہس نہس کیا تھا، غیر ملکی دشمنوں کو گرفتار کرایا تھا، آج انہی کا محکمہ انہیں سزا سنانے کی بات کر رہا تھا۔ سب نے سنا، انسپکٹر جمشید ایک عجیب پُراسرار سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے ...... کہہ رہے تھے:

"میں آپ کی زبانی فیصلہ سننا پسند کروں گا۔"

"تو پھر میں تمہیں اس ملازمت سے الگ کرتا ہوں، تحریری نوٹس تمہیں کل گھر مل جائے گا، اب اس محکمے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں رہ گیا۔"

"شکریہ! آپ نے مجھے بہت نرم سزا دی!" یہ کہتے ہی انسپکٹر جمشید اُٹھے اور خدا حافظ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ ڈی آئی جی اور دوسرے بھونچکے رہ گئے۔ اکرام بیٹھا نہ رہ سکا، تیزی سے اُٹھا اور کمرے سے نکلنے لگا۔

"اکرام! تم کہاں جا رہے ہو؟"

"انسپکٹر صاحب کے ساتھ.... میں ان کے بغیر یہاں نہیں رہ سکتا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پھر تم بھی استعفیٰ لکھ دو۔" آئی جی خشک لہجے میں بولے۔

"بہتر!" یہ کہتے ہوئے اکرام باہر نکل گیا۔

"یہ.... یہ آپ نے کیا کیا؟" ڈی آئی جی ہکلائے۔

"میں اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا، وزیرِ خارجہ مجھ سے بہت جلد جواب طلب کرنے والے ہیں، سب سے پہلا سوال وہ یہی کریں گے کہ اس کوتاہی کے سلسلے میں انسپکٹر جمشید کو کیا سزا دی گئی۔"

"لیکن اگر انسپکٹر جمشید چاہتے تو انہیں کوئی بھی اس محکمے سے نہیں نکال سکتا تھا، ان کے پاس صدرِ مملکت کا اجازت نامہ ہے جس کی رُو سے ان سے جواب طلبی نہیں کی جا سکتی اور جس معاملے میں بھی وہ چاہیں، اپنی زبان بند رکھ سکتے ہیں۔" ڈی آئی جی بھرائی ہوئی آواز میں کہتے چلے گئے۔

"میں یہ سب باتیں جانتا ہوں، اس کے باوجود میں مجبور تھا،

صدرِ مملکت چاہیں تو مجھے برطرف کر دیں، لیکن اس وقت میرا فرض یہی تھا۔" آئی جی بولے۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا دن بھی دیکھنا ہو گا!" یہ کہتے ہوئے ڈی آئی جی اُٹھ کھڑے ہوئے، ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ کچھ دوسرے آفیسر بھی حد درجے غمگین تھے، انسپکٹر خاور رحمانی اور دو ایک اور انسپکٹر بہت خوش تھے۔ انسپکٹر جمشید کے ہوتے ہوئے کبھی ان کی دال نہیں گلی تھی۔

جوتے کا نشان

انسپکٹر جمشید اپنے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اپنی چیزیں سمیٹ رہے تھے، بابا فاضل کو کچھ پتا نہیں تھا کہ ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے، اتنے میں اکرام اندر داخل ہوا، آہٹ پا کر انسپکٹر جمشید مڑے اور اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مسکرائے،

"یہ آنسو کس خوشی میں بہا رہے ہو؟"

"میں بھی استعفیٰ دے رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ایسی غلطی نہ کرنا۔" انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔

"میں آپ کے بغیر یہاں نہیں رہ سکتا، یہ کمرہ اور اس کمرے کی ایک ایک چیز مجھے کاٹ کھانے کو دوڑے گی، نہیں! میں آپ کے بغیر یہاں کسی قیمت پر نہیں رہ سکتا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی میز پر بیٹھ گیا اور استعفیٰ لکھنے لگا۔

"پاگل نہ بنو اکرام! اچھی ملازمت کا ملنا آج کل بہت مشکل ہے۔"

"پروا نہیں، اور اب تو میں اس لیے بھی نہیں رُک سکتا کہ آئی جی صاحب سے کہہ آیا ہوں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"کیا بات ہے جناب؟" بابا فاضل نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"انسپکٹر صاحب کو برطرف کر دیا گیا ہے، میں بھی استعفیٰ دے رہا ہوں۔"

"تو پھر میں یہاں رہ کر کیا کروں گا، میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔"

"ارے! کیا سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بُرا مان کر کہا۔

"آپ کچھ بھی کہیں، آپ کے بغیر یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہا جائے گا۔" بابا فاضل نے کہا۔

اتنے میں کچھ دوسرے لوگ بھی وہاں آ گئے۔ ان میں زیادہ تر انسپکٹر جمشید سے ہمدردی رکھتے تھے۔ وہ افسوس کرنے لگے۔

"آپ لوگ فکر نہ کریں، میں یہ نوکری روزی کمانے کے لیے ہرگز نہیں کرتا، یہ تو میرا شوق ہے، یہاں سے الگ ہو کر تو میں اس سے بھی کہیں زیادہ کما سکتا ہوں۔"

"آپ ہمیں بہت یاد آئیں گے۔" انصاری صاحب بولے، یہ آئی جی کے اسسٹنٹ تھے۔

"آپ کا جب جی چاہے، مجھ سے ملاقات کے لیے آ سکتے

ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنا مختصر سا سامان اُٹھائے باہر نکل رہے تھے، سب لوگ آنکھوں میں آنسو لیے انہیں الوداع کہہ رہے تھے۔ اکرام اور بابا فاضل ان کے ساتھ تھے، انہوں نے دونوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر انہوں نے ایک نہ سُنی اور یہی جواب دیا کہ وہ ان کے بغیر کسی قیمت پر یہاں کام نہیں کریں گے۔

وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ گئے۔ اکرام اور بابا فاضل کو انہوں نے ٹیکسی پکڑنے کے لیے کہا، کیونکہ فی الحال وہ بھی ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ پھر جونہی وہ گھر کے سامنے پہنچے، انہوں نے وہاں دھوئیں کے بادل اُٹھتے دیکھے، وہ دھک سے رہ گئے؛ چہرے پر خون دوڑ گیا، پہلا خیال یہ آیا کہ شاید مکان میں آگ لگ گئی ہے، لیکن کوئی بھی آگ آگ نہ چلا رہا تھا، نہ ہی لوگ اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے، پھر یہ کیسا دھواں تھا۔ موٹر سائیکل روک کر وہ نیچے اُتر آئے اور دھوئیں تک پہنچ گئے۔ اب انہیں معلوم ہوا، دھواں گھر کے دروازے پر پھیلا ہوا تھا، اندر سے نہیں اُٹھ رہا تھا۔ وہ چکر کاٹ کر دروازے پر پہنچے تو انہوں نے محمود، فاروق، فرزانہ اور بیگم کو وہاں کھڑے پایا، کچھ فاصلے پر بیگم شیرازی بھی کھڑی تھیں، دوسرے پڑوسی بھی خوفزدہ نظروں سے دھوئیں کے بادل کو دیکھ رہے تھے:

"کیا معاملہ ہے؟" انہوں نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"اوہ! ابا جان آپ آ گئے۔" فرزانہ نے چہک کر کہا۔

"ہاں! یہ سب کیا ہے؟"

"یہاں ایک نوجوان کو گولی ماری گئی تھی، پھر ایک دھماکا ہوا اور دھواں پھیل گیا، دھواں عین لاش کے اوپر اُٹھ رہا ہے۔" محمود نے بتایا۔

"اوہ! شاید دھوئیں کا بم پھینکا گیا ہے۔" ان کے منہ

"مگر وہ نوجوان کون تھا؟"

"وہ آپ سے ملنے آیا تھا... نزاکت رفیق اس کا نام تھا۔ ایک سُرخ فائل اسے دی گئی تھی، جو یہاں پہنچانی تھی، مگر وہ فائل کہیں اور چھوڑ آیا اور یہی بات بتانے وہ یہاں آیا تھا۔"

"کیا کہا، سُرخ فائل؟" ان کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں!" فرزانہ بولی۔

"اوہ! کیا اس لڑکے نے سنہری فریم کی عینک لگا رکھی تھی اور نیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا؟" انہوں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"جی ہاں! لیکن آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا؟" محمود نے حیرت زدہ لہجے میں کہا، چاروں کا مارے حیرت کے بُرا حال تھا۔

"اُف خدا ـــــ یہ کیا ماجرا ہے۔" ہر آن اُلجھنیں بڑھتی ہی جا

رہی ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"آخر بات کیا ہے؟"

"پہلے یہ دھواں تو چھٹ لے، پھر اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤں گا، کیا تم پولیس کو فون کر چکے ہو؟"

"جی ہاں! میں فون کر چکا ہوں، انسپکٹر زاہد آتے ہی ہوں گے۔" محمود نے کہا۔

انسپکٹر زاہد کے آنے سے پہلے دھواں چھٹ گیا اور پھر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، تھوڑی دیر پہلے جس جگہ لاش موجود تھی، وہاں اب کچھ بھی نہ تھا۔ زمین پر خون ضرور پھیلا ہوا تھا۔ انسپکٹر زاہد تو رپورٹ درج کر کے اور ان کے بیانات لے کر چلا گیا اور وہ اندر آ بیٹھے۔

"اب تم مجھے اس نوجوان کے بارے میں پوری تفصیل سے بتاؤ۔" انہوں نے کہا۔

محمود نے نوجوان کے بارے میں پوری تفصیل دہرا دی۔ آدھے بٹن اور سیڑھی کے نشانات کے بارے میں بھی بتایا۔ آدھے بٹن کا ذکر سن کر انسپکٹر جمشید چونکے تھے۔ اس کے خاموش ہونے پر انہوں نے صبح سے اب تک پیش آنے والے واقعات سنائے، وہ دھک سے رہ گئے، کیونکہ یہ بات انہیں ابھی ابھی معلوم ہوئی تھی کہ انہیں برطرف کر دیا گیا ہے۔

"ابا جان! اگر وہ فائل اتنی اہم تھی تو آپ نے اسے ان لوگوں کے حوالے کیا ہی کیوں تھا۔ ہماری جان بے شک چلی جاتی، آپ کو فائل ان کے حوالے نہیں کرنی چاہیے تھی۔" فرزانہ بولی۔

"تم اس بات کو نہیں سمجھو گے، خیر اس بات کو چھوڑو، سوچنا یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں، ہمارے سامنے کون سا راستہ رہ گیا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"اب کسی راستے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" فاروق نے کندھے اچکائے۔

"کیوں؟ کیا تمہارے خیال میں ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہم اپنی تعلیم مکمل کریں گے اور آپ کوئی کاروبار شروع کر دیں، انکل اکرام اور بابا فاضل آپ کے ساتھی ہوں گے، اب آخر ان جاسوسی الجھنوں کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟" فاروق نے نئی تجویز پیش کی۔

"کیا تم چاہتے ہو، ہمارے ملک اور قوم کے دشمن دندناتے پھریں، انہیں کوئی روکنے اور ٹوکنے والا نہ ہو، میں تم پر واضح کر دوں کہ دشمن بھی دراصل یہی چاہتا ہے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں، یہ چکر اسی لیے چلایا گیا تھا۔ یہ ہمارے خلاف ایک کھلی سازش تھی، بلکہ اسے بھیانک سازش کہا جائے

تو بے جا نہ ہوگا۔"

"بھیانک سازش!" محمود کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! فائل اسی لیے حاصل کی گئی تھی کہ مجھے محکمے سے نکلوایا جا سکے۔ میں کچھ لوگوں کی نظروں میں ہر وقت کھٹکتا رہتا ہوں، ایسی کوشش پہلے بھی کئی بار کی جا چکی ہے، لیکن کامیابی نہیں ہو سکی، اس بار خوب سوچ سمجھ کر وار کیا گیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔ اب اگر ہم نے ان کا کھوج نہ لگایا تو ہمارے ملک کو بہت نقصان پہنچا سکتے ہیں اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"لیکن فائل ان کے ہاتھ لگنے کی صورت میں بھی تو بہت نقصان پہنچ چکا ہے۔ آخر اس فائل میں کیا تھا؟" محمود نے پوچھا۔

"ابھی مجھ سے یہ سوال نہ کرو۔"

"کیوں ابا جان! اب تو آپ محکمے کے ملازم بھی نہیں رہے اب بتا دینے میں کیا حرج ہے؟"

"حرج ہو نہ ہو، میں بتانا مناسب نہیں سمجھتا، ہاں! اس کیس کے ختم ہوتے ہی ضرور بتا دوں گا، تاکہ تم لوگ الجھن سے نجات حاصل کر لو۔"

"بہت اچھا جیسے آپ کی مرضی۔"

"ہمارے پاس اب صرف ایک راستہ ہے اور وہ راستہ

نزاکت رفیق کے گھر تک جاتا ہے۔ ابھی تک اس کیس میں نزاکت ہی بار بار سامنے آیا ہے، آئی جی صاحب کے چپراسی کو لفافہ پہنچانے والا وہی تھا، پھر جبار باقر کے گھر میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے جانے والا وہی تھا، وہی وہاں سرخ فائل چھوڑ آیا تھا، اس سرخ فائل میں اس وقت وہ کاغذات نہیں تھے جو رات حملہ آوروں کو دیتے وقت تھے، صاف ظاہر ہے، حملہ آوروں نے اس میں سے کاغذات نکال کر میری تصویر رکھ دی، ایسی تصویر جس کے سینے میں خنجر گڑا ہوا تھا۔ جس سے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہم انسپکٹر جمشید پر کاری ضرب لگا چکے ہیں۔ پھر یہ نوجوان یہاں آیا، وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور فائل کے متعلق اس نے تمہیں ایک کہانی بھی سنائی، لیکن اس کی کہانی اس وقت جھوٹ ثابت ہو جاتی ہے جب آدھا بٹن اس کی قمیص والے آدھے بٹن پر فٹ بیٹھ جاتا ہے، گویا وہ رات بھی حملہ آوروں کے ساتھ تھا اور ان لوگوں کے لیے باقاعدہ کام کر رہا تھا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر انہیں میری تصویر والی فائل جبار باقر کے گھر پہنچانے کی کیا ضرورت تھی، اس سوال کا جواب صاف ظاہر ہو چکا ہے، وہ یہی چاہتے تھے کہ جبار باقر میرے پاس دوڑا آتے اور میں اس کے ساتھ اس کے گھر جاؤں، میں وہاں سے نکلوں تو وہ

مجھے اس مکان تک لے جا کر قید کر دیں، تاکہ دفتر میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ میں فرار ہو گیا ہوں، ادھر حملہ آوروں میں سے ایک آئی جی صاحب کو یہ بتانے پر تلا ہوا تھا کہ رات ہمارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، تاکہ آئی جی میرے خلاف غصے سے بھر جائیں اور یہی ہوا، جونہی میں قید سے نکل کر دفتر پہنچا آئی جی صاحب نے مجھے سزا سنا دی.... اور اس طرح انہوں نے ایک وار کر کے دو فائدے حاصل کر لیے، ایک تو وہ فائل حاصل کر لی اور دوسرے مجھے الگ کرا دیا۔ یہی وہ چاہتے تھے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"اُف خدا —— یہ تو واقعی بہت بھیانک سازش تھی۔"

"ہاں! اور ہم پوری طرح ان کے جال میں آ گئے، لیکن خیر میں ان لوگوں کو دیکھ لوں گا۔" انہوں نے کہا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"تم لوگ یہاں آرام کرو، میں اکیلا ہی نزاکت رفیق کے گھر ہو آتا ہوں۔"

"جی نہیں! ہم بھی ساتھ ہی چلیں گے۔" محمود نے کہا۔

"اچھا تو بابا فاضل کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں اور ہم پانچوں چلتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

وہ گھر سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھے۔ انہوں نے شام نگر کا پتا بتایا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ گلی نمبر ۱۳ کے مکان نمبر ۹ کے سامنے کھڑے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک نوجوان نکلا۔ انسپکٹر جمشید نے اس سے کہا:

"ہمیں نزاکت رفیق سے ملنا ہے۔"

"فرمائیے، میرا ہی نام نزاکت رفیق ہے۔"

"کیا!!" ان کے منہ سے حیرت زدہ لہجے میں نکلا... یہ نوجوان وہ نہیں تھا جو ان کے گھر آیا تھا، اسے تو ان کے سامنے گولی لگ گئی تھی اور وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ پھر دھوئیں کا بم مار کر اس کی لاش کو غائب کر دیا گیا تھا، اور یہ نوجوان کہہ رہا تھا کہ نزاکت رفیق اس کا نام ہے۔ اس کے چہرے پر نہ تو سنہری عینک تھی، نہ ٹھوڑی میں گڑھا تھا اور نہ ہی نیلے رنگ کے کپڑے پہنے تھا۔

○

"نزاکت رفیق آپ کا نام ہے۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"جی ہاں! اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔" اس نے بھی حیران ہو کر کہا۔

"کیا اس گھر میں نزاکت رفیق نام کا کوئی اور آدمی بھی رہتا ہے؟"

"جی نہیں! یہ میرا مکان ہے اور یہاں میرے اور میرے بیوی بچوں کے سوا کوئی نہیں رہتا۔" اس نے جواب دیا۔

"حیرت ہے، ایک نوجوان نے ہمیں اپنا نام نزاکت رفیق بتایا تھا اور یہ پتا دیا تھا، لیکن اس نوجوان کی شکل صورت آپ سے بالکل مختلف تھی۔ اس نے آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا، نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کی ٹھوڑی میں گڑھا تھا، کیا آپ کسی ایسے آدمی کو جانتے ہیں؟"

"جی نہیں! مجھے حیرت ہے، اس نے میرا نام اور پتا کیوں اپنایا۔" اس نے کہا۔

"یہ حیرت ہمیں بھی ہے، لیکن اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسے آپ کا نام اور پتا بالکل صحیح معلوم تھا۔ آپ کے مکان کے دروازے پر آپ کے نام کی تختی بھی نہیں لگی ہوئی۔"

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس نے میرا نام کس طرح معلوم کیا ہوگا، آپ کو اس سے کیا کام ہے؟"

"بس اس سے ملنا تھا، اچھا خدا حافظ.... ہم نے آپ کو زحمت دی۔"

"کوئی بات نہیں!" اس نے کہا اور وہ سڑک کی طرف
ں پڑے۔

"ابا جان! کیا تصویر والی فائل آپ جبار باقر کے پاس ہی
وڑ آئے تھے؟"

"نہیں! ساتھ لے آیا تھا، لیکن جب اس مکان میں مجھے
ش آیا تو فائل وہاں کہیں نہیں تھی... اوہ... وہ مکان...
ے تو ہم بھول ہی گئے۔ ہمیں اس کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔"
ود نے چونک کر کہا۔

"بہت خوب! وہاں بھی ہو آتے ہیں، شاید کوئی سراغ مل
ائے۔" اکرام نے خوش ہو کر کہا۔

مکان کا دروازہ جوں کا توں پڑا تھا، ان کتوں کا دور دور
ک پتا نہیں تھا جو انسپکٹر جمشید پر حملہ آور ہوئے تھے، ابھی سورج
روب نہیں ہوا تھا، اس لیے مکان کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ مکان
رف ایک کمرے کا تھا، وہ بھی کچی دیواروں کا، اگر دروازہ نہ بھی
ٹتا تو انسپکٹر جمشید دیوار گرا کر باہر نکل سکتے تھے اور اس کا مطلب
ہ تھا کہ حملہ آوروں کا مطلب انہیں قید میں رکھنے کا نہیں تھا،
ہ تو تھوڑی دیر کے لیے انہیں وہاں روکنا چاہتے تھے۔

وہ کمرے میں داخل ہوئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ایک
رف مٹی کا ایک گھڑا رکھا تھا، لیکن اس میں پانی نہیں تھا،

گھڑے کے پاس زمین پر مٹی کا ایک پیالا بھی موجود تھا۔ کمرے
کے بیچوں بیچ جس جگہ انسپکٹر جمشید نے خود کو بے ہوش پایا تھا
چند جوتوں کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ ان میں سے
کم از کم ایک آدمی کے جوتے کے تلے میخوں والے تھے، میخوں
کے نشان بھی صاف تھے، البتہ دائیں پیر کے جوتے میں درمیان
میں ایک میخ کم تھی، شاید وہ ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ان نشانات پر جھک
گئے۔ انسپکٹر جمشید نے میخوں کے نشانات پر خاص توجہ دی تھی اور
انہیں باقاعدہ گنا تھا، دائیں جوتے میں ایک میخ کم ہی نکلی۔ انہوں
نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا:

"ہمیں اس آدمی کو ڈھونڈنا ہے جس کے دائیں جوتے کی ایک
میخ کم ہے۔"

"لیکن ابا جان! ہم اسے کس طرح ڈھونڈ سکتے ہیں، کیا ہم لوگوں
کے جوتے اٹھا اٹھا کر دیکھیں گے؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں! اس کے لیے ہمیں اور ہی طریقہ اختیار کرنا ہو گا،
اس واردات کے لیے یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ کچھ غنڈوں
سے کام لیا گیا ہے۔ ہم ایک ہوٹل میں چلیں گے، وہ ہوٹل غنڈوں
کا ٹھکانا ہے، اگر ہمیں وہاں کوئی ایسا جوتے کا نشان مل گیا جس
کی ایک میخ کم ہوئی تو شاید ہم کامیاب ہو جائیں۔ ورنہ اس مرتبہ
بہت ہی چالاک مجرم سے واسطہ پڑا ہے اور ابھی تک میں

اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ خیر تم فکر نہ کرو۔
اب ہم گھر چل کر کچھ دیر آرام کریں گے اور رات کو نو بجے
ہوٹل بغداد چلیں گے۔"

"ہوٹل بغداد؟" فرزانہ نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! اس کا یہی نام ہے۔"

انسپکٹر جمشید نے کہا اور کچھ سوچ کر عجیب سے انداز میں
مسکرانے لگے۔

پروگرام بگڑتا ہے

ہوٹل بغداد جانے سے پہلے گھر واپس جانا ضروری تھا، کیونکہ
ہوٹل بغداد جانے کے لیے خاص انتظامات کی ضرورت تھی۔
گھر کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے گھنٹی کا بٹن دبایا، دروازہ
بیگم جمشید نے کھولا، ساتھ ہی اندر سے کئی آدمیوں کے باتیں
کرنے کی آوازیں سنائی دیں،

"اوہو، معلوم ہوتا ہے، اندر مہمان آ چکے ہیں۔" انسپکٹر جمشید
نے مسکرا کر کہا۔

"آوازیں تو پروفیسر انکل اور انکل خان رحمان کی ہیں۔" محمود
نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں! وہ آپ لوگوں سے بہت ناراض ہیں۔" بیگم جمشید بولیں۔

"کیا مطلب! بھلا وہ مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟" انسپکٹر جمشید
نے حیران ہو کر کہا۔

"اندر چل کر خود ہی معلوم کر لیں۔" بیگم جمشید بولیں۔

وہ اندر داخل ہوئے تو تھوڑی کے لیے سب خاموش ہو

گئے۔ اندر نہ صرف خان رحمان اور پروفیسر داؤد موجود تھے بلکہ ان
کے ساتھ شائستہ، حامد، سرور، ناز اور بیگم رحمان بھی تھے۔

"ہم تم سے سخت ناراض ہیں۔" پروفیسر داؤد نے بلند آواز
میں گویا اعلان کیا۔

"میں یہ خبر سن چکا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"انکل، کیا ہم تینوں سے بھی ناراض ہیں؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"نہیں! تم تینوں سے ناراض ہونے کی کوئی وجہ ہمارے
پاس موجود نہیں۔" خان رحمان بولے۔

"تو پھر مجھ غریب سے ناراض ہونے کی کیا وجہ ہے آپ
لوگوں کے پاس؟"

"جب محکمے والوں نے تمہیں جواب دے دیا ہے تو پھر
کیوں مارے مارے پھر رہے ہو، لعنت بھیجو، محکمے پر اور محکمے
کے کاموں پر، تمہارے لیے کاموں کی کیا کمی ہے، میری ساری
زمینیں تمہاری ہیں۔ ان میں سے ہمیں تو بس اتنا دیتے رہنا
کہ گھر کا گزارا چل جائے، ساری عمر بھی اس سے زیادہ مانگ
جائیں تو کہنا۔" خان رحمان کہتے چلے گئے۔

"اور کیا، جب سے میں نے یہ خبر سنی ہے، کسی کام کو
ہاتھ نہیں لگایا، شائستہ کو لیا اور سیدھا یہاں چلا آیا، ایک تم
ہو کہ اب بھی اسی کام کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔" پروفیسر

داؤد بولے۔

"میں نے آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کی بھی فون پر خوب خبر لی ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

"ارے! یہ آپ نے کیا کیا، اس میں ان کا کیا قصور؟"

"تو کیا تمہارا قصور ہے، اب اگر مجرم زبردستی تم سے وہ فائل لے گئے تو تم کیا کر سکتے ہو۔" پروفیسر بولے۔

"ان کا جو فرض تھا، انہوں نے کیا، میرا جو کام ہے، میں کر رہا ہوں، یہ بات آپ لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں یہ ملازمت تنخواہ کے لیے نہیں کرتا، یہ تو صرف میرا شوق ہے۔" انہوں نے جواب میں کہا۔

"پھر بھی... ہم یہ چاہتے ہیں، جب تک محکمے کے لوگ تم سے معافی نہ مانگ لیں، تم کوئی کام نہ کرو، چند دن کے اندر پتا نہ چل گیا تو میرا نام بدل دینا، سر پکڑ کر روئیں گے..." خان رحمان بولے۔

"اچھی بات ہے، اگر آپ لوگ یہ چاہتے ہیں تو میں کچھ نہیں کروں گا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ ملک اور قوم کے دشمن بھی یہی چاہتے ہیں کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں، اب کیا آپ ملک و قوم کے دشمنوں کی مرضی پوری کرنا چاہتے ہو، اس طرح وہ کامیابی پر کامیابی حاصل کرتے چلے جائیں گے

ملک اور قوم کو نقصان پر نقصان پہنچتا چلا جائے گا۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہم سب تمہارے ساتھ ہیں، لیکن تم محکمے کا رخ نہیں کرو گے۔" خان رحمان نے ان کی بات مانتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں خود وہاں نہیں جاؤں گا۔"

"اس کا مطلب ہے، وہ لوگ بلائیں گے تو چلے جاؤ گے۔" پروفیسر داؤد نے آنکھیں نکالیں۔

"اگر آپ لوگ کہتے ہیں تو ان کے بلانے کے باوجود بھی نہیں جاؤں گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"بہت خوب! یہ ہوئی نا بات۔" خان رحمان خوش ہو کر بولے۔

"ویسے اس موقعے پر میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ تم نے اپنا خصوصی اجازت نامہ کیوں استعمال نہ کیا، تم آئی جی کو وہ دکھا کر خاموش کر سکتے تھے۔"

"وہ اجازت نامہ مجھے اپنے افسروں کے خلاف استعمال نہیں کرنا چاہیے، ان کی عزت کرنا میرا فرض ہے۔" انہوں نے کہا۔

"میرا ارادہ ہے، وزیر خارجہ اور صدرِ مملکت سے اس سلسلے میں بات کروں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اس کی کیا ضرورت ہے، آپ لوگ تو مجھے دوبارہ محکمے میں بھیجنا ہی نہیں چاہتے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے، لیکن میں محکمے کے لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انسپکٹر جمشید تنہا نہیں، اس کے ساتھ اس کے دوست موجود ہیں، جو اسے کسی حال میں نہیں چھوڑ سکتے۔"

"اب ان لوگوں سے اس قسم کی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" انہوں نے کہا۔

"خیر! جیسے تمہاری مرضی!" خان رحمان نے کہا پھر ہنس کر بولے، "اور اب تم یہ بتاؤ کہ ملازمت چھوٹ جانے کی خوشی میں کیا کھلا رہے ہو؟"

"جو تم کہو، تیار کرا دیا جائے۔" انہوں نے کہا۔

"تلی ہوئی مچھلی کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"اس بے چاری کے متعلق کیا خیال ہو سکتا ہے انکل، وہ تو تلی جا چکی ہو گی۔" فاروق بول پڑا جس پر سب نے ایک قہقہہ لگایا۔

"پروگرام نہایت شاندار رہے گا، ہم ان کی ملازمت چھوٹ جانے کا جشن منائیں گے۔ کہو تو دو چار اخباری رپورٹروں کو بھی دعوت دے ڈالی جائے۔" پروفیسر ہنسے۔

"نہیں! اس کی کیا ضرورت ہے، سوال یہ ہے کہ مچھلی بازار سے لائی جائے یا شکار کی جائے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"جمشید اور شکار کی بات کرے، یہ ایک ہی ہوئی۔" خان رحمان

کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اور وہ اس وقت ہوں گی، جب میں بھی شکار کی بات کر بیٹھوں گا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"مزا تو شکار کی مچھلی کا ہی آئے گا۔" خان رحمان بولے۔

"تو پھر یہ پروگرام کل پر چھوڑ دو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا تم نے یہ ضرب المثل نہیں سنی کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑو۔" خان رحمان بولے۔

"ابھی یہ بات کہاں ثابت ہوئی ہے کہ یہ آج کا کام ہے۔" محمود نے کہا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے، تو ٹھیک ہے، ہم کل مچھلی کے شکار پر چلیں گے اور اس کے بعد اس گھر میں تلی ہوئی مچھلی کے شکار کا لطف اٹھائیں گے۔" خان رحمان بولا۔

"لیکن انکل! اگر کوئی مچھلی کانٹے میں پھنسی ہی نہ تو؟" فاروق نے سوال کیا۔

"تو دریا کے کنارے پر بسنے والے ماہی گیروں سے خرید کر لے آئیں گے۔" خان رحمان فوراً بولے۔

"پھر تو یہ بہتر رہے گا کہ شکار کھیلا ہی نہ جائے، سیدھے دریا پر جائیں اور مچھلیاں خرید کر لے آئیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"اس صورت میں دریا پر جانے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟"

شہر میں بھی تو مچھلیوں کی دکانیں ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"شہر میں تو تلی تلائی مچھلی بھی مل جاتی ہے، گھر لا کر تلنے کی ہی کیا ضرورت ہے۔" حامد بول اٹھا۔

"پھر تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ گھر میں لانے کی بھی کیا ضرورت ہے، وہیں چل کر بھی کھا سکتے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"بھئی رحمان! تمہارا جشن کا پروگرام تو ہر لمحے سکڑتا جا رہا ہے۔ کہیں یہ بالکل ہی ختم نہ ہو جائے۔" پروفیسر داؤد نے ہنس کر کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے، لہٰذا اس موضوع پر گفتگو ختم کر دینی چاہیے، بس یہ طے رہا کہ کل ہم مچھلی کے شکار پر چلیں گے، سب سامان میں گھر سے لے آؤں گا۔" خان رحمان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کل صبح کی بجائے، یہ پروگرام کل شام پر نہیں ٹالا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"ٹالنے کو تو یہ پرسوں اور اترسوں پر بھی ٹالا جا سکتا ہے۔" خان رحمان نے بُرا سا منہ بنایا۔

"نہیں! اتنا لمبا ٹالنے کا پروگرام نہیں، کل شام ہی ٹھیک رہے گا۔" انہوں نے کہا۔

"چلو یونہی سہی۔" خان رحمان نے ان کی بات مان لی۔

"اترسوں کے بعد کیا کہا جاتا ہے، یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔" محمود نے نیا نکتہ اٹھایا۔

"اترسوں کے بعد اس دن کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ایسی بیکار کی باتوں میں اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو۔" فرزانہ بولی۔

"تو اسے یہ بھی بتا دو کہ کس قسم کی باتوں میں اپنے ذہن کو پریشان کرے۔" فاروق بول پڑا۔

"مجھے ذہن کو پریشان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اس کام کے لیے تم ہی کیا کم ہو۔" محمود ہنسا۔

"ویسے یار! وہ لوگ تھے کون جو تم سے سرخ فائل لے اڑے، کیا وہ ضرورت سے زیادہ ہی ہوشیار اور تیز طرار تھے، کیونکہ تم سے کوئی چیز حاصل کرنا اتنا آسان تو نہیں۔" خان رحمان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بنایا گیا تھا۔" انہوں نے گول مول جواب دیا۔

"پھر بھی یہ بات عجیب سی لگتی ہے۔" خان رحمان بولے۔

"آپ صرف عجیب کی بات کر رہے ہیں، ہمیں تو غریب بھی لگتی ہے، لیکن چونکہ ہمارے ساتھ بیت چکی ہے، اس لیے کیا کہہ سکتے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"کہہ تو بہت کچھ رہے ہو، زبان بند کب سے تمہاری۔"

فاروق نے منہ بنایا۔

"جمشید! کیا تم ان لوگوں کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکے کہ وہ کون تھے؟"

"میں نے ان میں سے صرف ایک کو دیکھا تھا، لیکن وہ میک اپ میں تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تب پھر، فاروق اور فرزانہ نے جن دو کو دیکھا تھا، وہ بھی میک اپ میں ہی آئے ہوں گے۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میرا خیال ہے، تم ان کا خیال تو دل سے نہیں نکال سکو گے۔"

"نہیں! میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک انہیں قانون کے حوالے نہ کر دوں، وہ میرے ہی نہیں اس ملک اور قوم کے بھی دشمن ہیں، اگر معاملہ صرف میری ذات کا ہوتا تو میں آرام سے بیٹھ جاتا ہے۔"

"لیکن اب تم کرو گے کیا، قانون تو تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔" پروفیسر داؤد نے پریشان ہو کر کہا۔

"قانون ایک وطن پرست شہری کا ساتھ کیوں نہیں دے گا، اور پھر انہیں تو صرف اتنا ہی کرنا ہو گا کہ مجرموں کو آ کر گرفتار کر لیں۔ باقی کام تو میں خود ہی کر لوں گا۔"

"جہاں تک میرا خیال ہے، مچھلی کے شکار کے چکر میں تم
ں کا کھانا گول کر جانے کی فکر میں ہو۔" خان رحمان نے کہا۔

"نہیں تو..... بیگم کیا ان لوگوں کو کچھ کھلانے کا پروگرام نہیں؟"
ر جمشید چونکے۔

"کیوں نہیں، آپ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں، میں بے شک یہاں
ی ہوں، لیکن میرا ذہن باورچی خانے میں اٹکا ہوا ہے۔" بیگم جمشید
ے مسکرا کر کہا۔

"ہائیں! تو کیا امی جان آج آپ کھانا صرف ذہن سے پکائیں گی؟"

"نہیں! میں ہر دس منٹ بعد ٹہلنے کے انداز میں اٹھ کر اندر
اتی رہی ہوں، اس طرح کسی کو میری غیر حاضری بھی محسوس نہیں
ئی اور اندر سب کے لیے کھانا بھی تیار ہو گیا۔" انہوں نے
سکرا کر کہا۔

"بھئی واہ! مزا آ گیا..... بھابی ہو تو ایسی۔" خان رحمان کے
ے میں خوشی سے زیادہ حیرت تھی۔

اور ایک وہی نہیں، سبھی بیگم جمشید کی ذہانت اور مہارت
یرت زدہ رہ گئے تھے۔

○

ہوٹل بغداد کے صدر دروازے میں ایک بوڑھا دو لڑکوں

اور ایک لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہُوا۔ چاروں کے لباس شاہانہ تھے۔ بیروں نے لپک کر ان کا سامان اُٹھا لیا۔ بوڑھا کاؤنٹر پر آیا اور بلند آواز میں بولا؛

"ہمیں دو ڈبل کمرے چاہئیں"

"کرایہ سو روپے روزانہ ہوگا" کلرک نے کہا۔

"بہت خوب!" بوڑھے نے کہا اور جیب سے پانچ سو روپے والے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکالی۔ ہال میں بیٹھے ہوئے بدمعاش چونک کر اس کی اور نوٹوں کی گڈی کی طرف دیکھنے لگے۔ بوڑھے نے ایک شان کے ساتھ گڈی میں سے تین چار نوٹ نکالے اور کاؤنٹر پر پھینک دیے؛

"یہ جمع کر لو، جب پورے ہو جائیں، بتا دینا، ہم چند دن یہاں رہیں گے، کھانا دونوں ٹائم ہمارے کمرے میں ہی آئے گا، البتہ ہم کافی ہال میں آکر پیا کریں گے"

"بہت خوب" کلرک نے رجسٹر کھولتے ہوئے کہا "اپنے نام لکھوا دیجئے"

"پروفیسر نورانی اور یہ میرے بچے داؤد، خاور اور صوفیہ ہیں"

"بہت خوب، آپ کے کمرے دوسری منزل پر ہیں، نمبر ایک سو بیس اور اکیس ہیں۔ کلرک نے چابیاں ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"چار سو بیس اور اکیس نمبر بھی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے"
ڑھے نے لاپرواہی سے کہا۔

"جی! میں سمجھا نہیں!" کلرک نے چونک کر پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں، رہنمائی کے لیے بیرا ساتھ کر دیں"

وہ بیرے کے ساتھ زینہ طے کرنے لگے۔

"ہال میں بیٹھے ہوئے بیسیوں غنڈے ہمیں گھور رہے ہیں" صوفیہ نے گھبرا کر کہا۔

"تو گھورنے دو، ہمارا کیا جاتا ہے" خاور بولا۔

"مجھے ڈر ہے، کہیں یہ لوگ ہماری نقدی نہ ہتھیا لیں" داؤد بولا۔

"پروا نہیں! ہم اور نقدی بنک سے نکلوا لیں گے، آخر لاکھوں روپے کس دن کام آئیں گے" بوڑھے نے کہا۔

بیرا انہیں چونک کر دیکھنے لگا، لاکھوں روپے کے نام پر اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"ہمارے پاس آج کل دولت خرچ کرنے کے سوا کام ہی کیا رہ گیا ہے" خاور نے کہا۔

"بالکل ٹھیک، اسی لیے اس شہر میں کافی پیسے بنک کے ذریعے
ے لے کر آئے ہیں کہ چند دن تک دونوں ہاتھوں سے لٹائیں گے"

اسی وقت وہ دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ بیرے نے انہیں کمرہ نمبر ایک سو بیس اور اکیس کے سامنے پہنچا دیا۔ بوڑھے نے

ایک سو بیس نمبر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ بیرے نے سامان اندر رکھا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی خاور نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور مڑتے ہوئے بولا:

"میرا خیال ہے، ابا جان! اب غنڈوں کے یہاں آنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

"ہاں فاروق! تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ اس مرتبہ وہ اپنی اصلی آواز میں بولے تھے اور یہ انسپکٹر جمشید کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی اپنی جیب میں سے پاؤڈر کی قسم کی کوئی چیز نکالی اور اسے فرش پر چھڑکنے لگے۔

نئے شکار

ٹھیک ایک گھنٹے بعد کمرہ نمبر ایک سو بیس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور محمود نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہاں تین لمبے تڑنگے آدمی کھڑے تھے:

"فرمایئے! کیا بات ہے۔" محمود نے تھر تھر کانپنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"ہٹو ایک طرف۔" ان میں سے ایک نے محمود کو ہاتھ سے دھکا دیتے ہوئے کہا اور وہ کئی گز تک لڑکھڑاتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی تینوں اندر داخل ہو گئے۔ ان کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹیں رقص کر رہی تھیں۔

"بھائی.... تم لوگ کون ہو.... اور کیا چاہتے ہو؟" انسپکٹر جمشید ڈری ڈری آواز میں بولے۔

"ہم اس شہر کے سب سے مشہور غنڈے ہیں، تمہاری جیبوں میں نوٹوں کی جتنی گڈیاں ہیں، نکال کر ہمارے حوالے کر دو۔"

سب سے آگے کھڑے بدمعاش نے کہا۔

"تت... تم... ان کا کیا کرو گے؟"

"ان سے عیش کریں گے، اور کیا کرتے۔" وہ ہنسا۔

"ہم ہوٹل کے مالک سے آپ لوگوں کی شکایت کریں گے۔" انسپکٹر جمشید کی آواز میں کپکپی تھی۔

"ہم انہیں بھی یہیں بلا لیتے ہیں، جاؤ پھیکے، استاد کو بلا لاؤ۔"

"بہت اچھا ٹامی۔" ایک نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

"یہ... یہ کیا... ہوٹل کا مالک تمہارا استاد ہے۔" فرزانہ نے ہکلا کر کہا۔

"ہاں! وہ ہمیں یہاں دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔" ٹامی ہنس کر بولا۔

"اس نے تمہیں کیا پڑھایا تھا بھائی۔" فاروق نے بوکھلا کر پوچھا۔

"وہ تمام گُر، جو دوسروں کو ٹھگنے کے کام آتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ارے باپ رے! ہم سمجھے تھے، الجبرا، جیومیٹری پڑھائی ہو گی۔" فرزانہ بولی۔

"بہتر یہی ہے کہ اُستاد کے آنے سے پہلے ہی نوٹوں کی گڈیاں ہمارے حوالے کر دو، ورنہ وہ تو تمہاری چیک بک بھی حاصل کر لے گا اور اس پر دستخط بھی کرا لے گا۔" ٹامی نے کہا۔

"یہ... یہ ہم کہاں آ پھنسے۔" انسپکٹر جمشید ہکلائے۔

"ہوٹل بغداد میں ـــــ تمہیں یہاں آنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟"

"اسٹیشن پر ایک شریف صورت آدمی سے کسی اچھے ہوٹل کے بارے میں پوچھا تھا، اس نے ہوٹل بغداد کا نام لیا۔"

"بس تو جان لو، وہ ہمارا ایجنٹ تھا، اس ہوٹل میں آنے والے اپنی جیبیں خالی واپس لے کر جاتے ہیں۔" ٹامی بولا۔

"کیا وہ یہاں سے نکل کر پولیس کے پاس نہیں جاتے ہوں گے۔"

"پولیس والے ہم سے باقاعدہ اپنا حصہ وصول کرتے ہیں، اس لیے وہ دکھاوے کے طور پر یہاں تفتیش کے لیے آتے تو ہیں، لیکن اپنا حصہ لے کر چپ چاپ چلے جاتے ہیں۔"

"اوہ! اس کا مطلب ہے، ہم پھنس گئے۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

اسی وقت ایک بہت لمبے قد کا آدمی اندر داخل ہوا، اس نے ناک سکیڑ کر کہا۔

"کیا بات ہے ٹامی... ذرا ذرا سی بات کے لیے مجھے کیوں بلاتے ہو؟"

"ہمارے نئے شکار تم سے ہماری شکایت لگانا چاہتے ہیں۔" ٹامی نے کہا۔

"یہ کیا بکواس ہے، اب تک تم نے ان کی جیبیں خالی کرائی ہیں یا نہیں؟"

"یہ کیا مشکل ہے، ابھی کر لیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے، چاروں خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگے۔ اس پر ان چاروں نے زور دار قہقہے لگائے، ٹامی بولا:

"اب اور پیچھے کس طرح جاؤ گے، دیواریں تو ہٹنے سے رہیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ان کے قریب پہنچ گیا، اس کے دونوں ساتھی بھی نزدیک آ گئے، استاد اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا۔ انہوں نے انسپکٹر جمشید کی جیبوں سے نوٹوں کی پانچ گڈیاں نکال کر اُستاد کے قدموں میں پھینک دیں، یہ گڈیاں سو سو اور پانچ پانچ سو کی تھیں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی جیبوں سے نوٹوں کی کوئی گڈی برآمد نہ ہوئی۔

"بس اُستاد! یہی کچھ ہیں۔"

"ٹھیک ہے، کافی لمبا ہاتھ مارا ہے۔" استاد نے جھک کر گڈیاں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس سے کئی گنا زیادہ کما سکتے ہو۔" اچانک انسپکٹر جمشید نے بلند آواز میں کہا۔

وہ چونک اُٹھے اور ان کی نظریں ان پر جم گئیں۔

"کیا مطلب؟" استاد کے منہ سے نکلا۔

"میں تمہیں دس لاکھ روپے اور دے سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" استاد کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"میرے ایک ملازم نے دھوکے سے میری زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے، اگر تم اسے ٹھکانے لگا دو تو میں تمہیں دس لاکھ روپے دے سکتا ہوں۔"

"ایسے کام صرف استاد کرتا ہے، ہم چھوٹے کاموں کے لیے ہیں۔" ٹامی بولا۔

"اس ملازم کا نام اور پتا بتاؤ۔" اُستاد نے جلدی سے کہا۔

"ہم چل کر اس کا گھر دکھا سکتے ہیں، اس کا حلیہ بھی بتا دیں گے، پھر تم جانو، تمہارا کام۔"

"دس لاکھ روپے کس طرح ادا کرو گے؟" استاد نے پوچھا۔

"جس طرح تم پسند کرو گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو ٹھیک ہے۔ تم نقد رقم کل لے کر آ جانا، کل رات کو ہی تمہارے ملازم کا کام تمام کر دیا جائے گا، اب چل کر اس کا گھر دکھانا ہوگا۔" اس نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔" انسپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

"تو پھر کب چل رہے ہو؟"

"آدھ گھنٹے بعد، ہم ذرا لباس تبدیل کریں گے۔"

"بہت اچھا! تم لوگ لباس تبدیل کرلو، ہم آدھ گھنٹے بعد آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے مطمئن لہجے میں کہا اور وہ لوگ باہر نکل گئے، انسپکٹر جمشید نے احتیاط سے چلتے ہوئے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور پھر فرش پر بننے والے جوتوں کے نشانات کا غور سے جائزہ لینے لگے، اچانک ان کی نظریں ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی وہاں آ گئے، یہ اسی جوتے کا نشان تھا جو انہیں کچے مکان میں ملے تھے۔

"یہاں استاد کھڑا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی۔

"جی ہاں! اس کا مطلب ہے، ہمیں جس آدمی کی تلاش تھی، وہ ہمیں مل گیا ہے۔" فرزانہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں! اور اب جلدی جلدی کپڑے بدل لو۔"

انہوں نے کپڑے تبدیل کیے ہی تھے کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ استاد انہی تین ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

"کیا تم تیار ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو پھر چلو!" اس نے کہا۔

"ہمارے ساتھ کون جائے گا؟"

"ہم چاروں!" استاد نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے، چاروں کا جانا مناسب نہیں، صرف تم چلو، کل جتنے آدمی جی چاہے ساتھ لے جانا۔" انسپکٹر جمشید نے تجویز پیش کی۔

"ہوں، بات تو ٹھیک ہے، آج تو ہمیں صرف موقع ہی دیکھنا ہے۔ اچھا تو چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ نیچے اُترے اور ہال میں سے ہوتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکل آئے... انہوں نے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روکا اور اس میں بیٹھ گئے۔

"کوئین برج چلو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہاں کون رہتا ہے؟" استاد نے پوچھا۔

"یہ ایک کمرے کا مکان ہے، میرا اپنا ہے، یہاں میں تمہیں اس شخص کی تصویر، اور دوسری معلومات مہیا کروں گا۔ اس کے بعد اس کے ٹھکانے پر لے چلوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

پچیس منٹ بعد ڈرائیور نے انہیں کوئین برج... پر اتار دیا۔ یہاں سے وہ پیدل ایک سمت میں روانہ ہوئے اور پانچ منٹ تک چلتے رہنے کے بعد ایک کمرے کے مکان کے سامنے رک گئے۔ یہ مکان انسپکٹر جمشید کا تھا اور وہ اسے خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتے تھے۔

انھوں نے اس کا تالا کھولا، اسی وقت اُستاد نے چونک کر کہا۔

"لیکن تم تو دوسرے شہر سے آئے تھے؟"

"ہاں! تو پھر! اس سے کیا ہوتا ہے، ہم چاروں اس چھوٹے سے کمرے میں کس طرح رہ سکتے تھے، جب سے ہمارے ملازم نے غداری کی ہے، ہم نے اس شہر میں آنا چھوڑ دیا ہے اور اب ایک مدت کے بعد آئے ہیں، اس دوران نہ جانے شہر میں کیا کیا تبدیلی آگئی ہو گی، اسی لیے ہم نے اسٹیشن پر اُترتے ہی اس آدمی سے کسی اچھے ہوٹل کا پتا پوچھا تھا۔" انسپکٹر جمشید رُکے بغیر کہتے چلے گئے اور اس کا شک دُور ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

وہ کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔ اندر ایک میز کے گرد چار کرسیاں موجود تھیں۔ انسپکٹر جمشید ایک کرسی میں ڈھیر ہو گئے۔ اُستاد نے دوسری کرسی سنبھالی، فاروق اور فرزانہ بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ محمود کے لیے کوئی کرسی نہ بچی، اس لیے وہ کھڑا رہ گیا۔

"تم بھی کرسی کے ہتھے پر ٹک جاؤ۔" انسپکٹر جمشید نے اس سے کہا۔

"کوئی بات نہیں ابا جان! میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے، ہمیں دروازہ اندر سے بند کر لینا چاہیے، تاکہ کسی کے دخل دینے کا خطرہ باقی نہ رہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس کی کیا ضرورت ہے، میرے ہوتے ہوئے، کون دخل دے سکتا ہے۔" اُستاد نے منہ بنایا۔

"پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہے۔" وہ بولے۔

"اچھی بات ہے، کر لو بند دروازہ۔"

محمود نے فوراً دروازے کی چٹخنی لگا دی۔

"سب سے پہلے میں تمہارا اصلی نام جاننا چاہوں گا، کیونکہ ظاہر ہے، اُستاد تمہارا اصلی نام نہیں ہو سکتا۔"

"تمہیں اس سے کیا غرض، تمہیں تو اپنے کام سے سروکار ہونا چاہیے، اپنے ملازم کی تصویر دکھاؤ، اور اس کے بارے میں جو کچھ بھی بتانا چاہتے ہو، بتا دو، کل صبح تم بنک سے نقد رقم نکلوا کر میرے حوالے کر دو گے، رات کو میں اس کا کام تمام کر دوں گا اور وہ کاغذات بھی لا دوں گا جو اس نے دھوکے سے تیار کرا لیے ہیں اور جن کی رُو سے اب وہ ان زمینوں کا مالک بن بیٹھا ہے، تم یہی چاہتے ہو نا؟"

"ہاں! یہی چاہتا ہوں، لیکن اس سے پہلے تمہیں اپنا نام تو بتانا ہی پڑے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آخر تم نام جان کر کیا لو گے؟" اس نے جھلا کر کہا۔

"اگر تم نام بتانے پر تیار نہیں تو پھر یہ سودا نہیں ہو سکتا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"خیر! اگر تم بضد ہو تو سن لو، میرا نام سراب خاں ہے۔"

"کیا یہ تمہارا بالکل اصلی نام ہے؟" انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں! آخر تم اس قدر کرید کیوں رہے ہو؟" اس کے لہجے میں حیرت اُتر آئی۔

"اس کا مطلب ہے، ہوٹل کے تمام غنڈے تمہارے اس نام سے قطعاً واقف نہیں۔" وہ بولے۔

"کیا مطلب؟" استاد سراب خاں بڑی زور سے چونکا۔

"سراب خان سے وہ واقف ہوتے تو ہوٹل میں ایک غنڈہ بھی نظر نہ آتا، سراب خان وہ آدمی ہے جس سے شریف لوگ تو کیا اچھے اچھے بدمعاش تھراتے ہیں۔ دس سال پہلے اس نے اس شہر میں ہل چل مچا دی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں تک کو نہیں بخشا تھا، لوٹ کا تمام کا تمام مال حاصل کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں تک کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا اور اس وقت جرائم پیشہ لوگ اس سے چھپتے پھرتے تھے۔ پولیس اس کی تلاش میں ناکام ہو گئی تھی۔ تمام بدمعاشوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ کبھی سراب خان کے

تھ کوئی کام نہیں کریں گے۔ پھر سراب خاں غائب ہو گیا اور
ں کا نام سننے میں نہیں آیا، سب نے یہی خیال کیا کہ کہیں
را گیا ہو گا۔ تمہیں دیکھنے کے بعد مجھے پہلا خیال یہی آیا تھا
کہ ہو نہ ہو، تم سراب خان ہو، اسی لیے میں تمہیں یہاں
ے آیا، ہوٹل میں تم دوسروں کے سامنے کبھی یہ نہ بتاتے
کہ تم سراب خاں ہو... ورنہ وہ سب تمہارا ساتھ چھوڑ جاتے
اور پولیس ایک بار پھر تمہارے پیچھے لگ جاتی، شاید تم نے
بغداد ہوٹل اس کے سابقہ مالک سے خرید لیا ہو گا۔"

انسپکٹر جمشید کہتے جا رہے تھے اور سراب خاں کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی حیران تھے۔ ان کے خاموش ہوتے ہی سراب خاں خوف زدہ لہجے میں بولا:

"تت... تت... تم... کون... ہو؟"

"میں وہ ہوں جس کے گھر سے رات تم نے سُرخ فائل اُڑائی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا!!!" سراب خاں اچھل پڑا، اس کی آنکھیں حیرت اور خوف کی زیادتی سے باہر کو اُبل پڑیں۔

دردناک کامیابی

"تم..... تم..... انسپکٹر جمشید ہو۔"

"ہاں دوست۔ تم نے بہت دیر میں پہچانا، خیر پہچان تو لیا، اسی لیے میں نے دروازہ بند کرا دیا تھا کہ کوئی ہماری باتیں نہ سن سکے۔ اب اگر تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم نے سرخ فائل کس کے کہنے پر اُڑائی تھی تو میں تمہیں جانے دوں گا اور یہ بات بھول جاؤں گا کہ تم دراصل سراب خاں ہو، بیسیوں آدمیوں کے قاتل... اور اگر تم نے نہ بتایا تو قانون کا سامنا کرنا ہوگا، اور یہ بات تو اس وقت بھی تمہیں بتانی ہی ہوگی، کیونکہ سرخ فائل کوئی معمولی فائل نہیں تھی، سراب خاں تم نہیں جانتے.....

..... تم نے کیا چیز دشمنوں کے حوالے کی ہے۔ اگر معلوم ہوتا اور تم میں ذرا بھی وطن کی محبت ہوتی تو ہرگز فائل ان کے حوالے نہ کرتے۔"... یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

سراب خاں بت بنا بیٹھا تھا۔ پھر وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا، اس نے دروازے کی طرف ایک چھلانگ لگائی دوسرے ہی

لمحے وہ چٹخنی گرا چکا تھا۔ دوسری طرف ان چاروں میں سے کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی تھی۔ انسپکٹر جمشید تو خیر اس ایک کمرے کے مکان سے واقف تھے ہی، محمود، فاروق اور فرزانہ بھی اس کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے، ورنہ اس وقت تک وہ سراب خاں کا راستہ روکنے کے لیے اُٹھ چکے ہوتے۔

سراب خاں نے چٹخنی گرا کر دروازے کا ہینڈل پکڑا اور اپنی طرف کھینچا، لیکن وہ ٹس سے مس بھی نہ ہوا، اس نے دو تین زبردست قسم کے جھٹکے مارے اور پھر جھلا کر ان کی طرف پلٹا!

"مجھے افسوس ہے سراب خاں! یہ دروازہ اب اسی وقت کھلے گا جب ہم چاہیں گے، دراصل یہ صرف ہمارے اشاروں پر چلتا ہے۔ میں ابھی انگلی کا اشارہ کر دوں، یہ پٹ سے کھل جائے گا، اگر تم چاہتے ہو، یہ کھل جائے تو تم اس آدمی کا نام بتا دو جس نے فائل اُڑانے کا کام تمہیں سونپا تھا" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"میں اس کا نام نہیں جانتا، یہ دروازہ کھول دو، ورنہ میں اسے توڑ دوں گا" سراب خاں نے غرا کر کہا۔

"اگر تم اسے توڑ کر دکھا دو تو میں اس آدمی کا نام ہرگز نہیں

پوچھوں گا اور اپنی جیب سے تمہیں پانچ سو روپے انعام الگ دوں گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

یہ سن کر سراب خاں نے پیچھے ہٹ کر دروازے پر کندھا رسید کیا، پھر اس پر دیوانگی سی طاری ہو گئی، اوپر تلے ٹکریں مارتا چلا گیا، لیکن دروازہ تھا کہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ سراب خاں سمجھ گیا کہ اس دروازے کو توڑنا اس کے بس کی بات نہیں، وہ تھکے تھکے انداز میں مڑا اور ان کی طرف آتے ہوئے بولا:

"ہیں... میں اس کا نام نہیں جانتا، حلیہ ضرور بتا سکتا ہوں۔"

"چلو حلیہ ہی بتا دو۔" انسپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

"اس سے پہلے یہ بتاؤ، اس فائل میں کیا تھا؟"

"تمہاری امیدوں سے بڑھ کر قیمتی چیز تھی اس میں اور مجھے یقین ہے، تم نے اسے کوڑیوں کے مول دشمن کے حوالے کر دیا ہو گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو کیا اس میں ہیرے جواہرات کا کوئی نقشہ تھا؟" سراب خاں نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"ہیرے جواہرات کیا چیز ہیں، ان سے بہت زیادہ قیمتی چیز تھی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آخر ایسی کیا چیز تھی؟" سراب خاں کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں! میں تمہیں یہ ضرور بتاؤں گا، ویسے تم نے فائل حاصل

کر کے دینے کا کتنا معاوضہ وصول کیا تھا؟"

"پچیس ہزار!"

"تم نے پچیس ہزار روپے لے کر بیسیوں آدمیوں کی زندگی داؤ پر لگا دی ظالم!" انسپکٹر جمشید نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"اس فائل میں ہمارے ان جاسوسوں کے نام اور دوسری معلومات درج تھیں جو دشمن ملک میں جاسوسی کر رہے ہیں۔"

"کیا!!!"

یہ کیا سراب خاں کے منہ سے نہیں، محمود، فاروق اور فرزانہ کے منہ سے نکلا تھا، ساتھ ہی ان کے چہروں کا رنگ اڑتا نظر آیا۔

○

"ہاں! فائل دشمنوں کے ہاتھ میں جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان سب کی جانیں خطرے میں پڑ گئیں، لیکن بات یہاں پر ہی ختم نہیں ہو جاتی، پہلے انہیں پکڑا جائے گا اور پھر ان سے ہمارے ملک کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں گی، ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جائیں گے اور ہو سکتا ہے، ان میں سے کچھ یہ ظلم و ستم برداشت نہ کر سکیں اور ان

کے سوالات کے جوابات دینے پر مجبور ہو جائیں۔ تم سوچ سکتے ہو، اس طرح کس قدر عظیم نقصان ملک کو پہنچے گا۔" وہ کہتے چلے گئے۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔ سہراب خاں تو پتھر کا بُت بنا بیٹھا تھا۔ آخر اس نے کہا۔

"کاش! مجھے اس فائل کی اہمیت معلوم ہوتی۔"

"تو تم کیا کرتے؟" فرزانہ نے تیزی سے پوچھا۔

"میں اس کے لاکھوں روپے وصول کر سکتا تھا، انسپکٹر تم نے ٹھیک ہی کہا تھا، میں نے فائل کوڑیوں کے مول دے دی۔" اس کے لہجے میں افسوس تھا۔

"تم کتنے بے رحم ہو، تمہارا ضمیر بالکل مُردہ ہو چکا ہے، تم صرف اپنی ذات کے لیے سوچتے ہو، تم نے کبھی دوسروں کے لیے نہیں سوچا... فائل کے متعلق جان کر بھی تمہیں یہ افسوس نہیں ہوا کہ وہ تم نے دشمن ملک کے جاسوسوں کے حوالے کیوں کر دی، افسوس ہوا تو صرف اس قدر کہ بہت سستی فروخت کر دی۔ اب میں تمہیں قانون کے حوالے ضرور کروں گا، ہاں اس کا حلیہ بتاؤ، جس نے تمہیں اس کام پر لگایا تھا۔"

"اب میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"مجھے معلوم کرنا آتا ہے، اس مکان کا دروازہ، تم لاکھ سر پٹخو،

نہیں کھل سکے گا جب تک ہم نہ چاہیں، لہٰذا تم بھاگ کر تو جا نہیں سکو گے، پھر کیا ارادہ ہے؟"

"میں نکل جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ انسپکٹر جمشید کی طرف جھپٹا۔

"ٹھہرو! پہلے چند باتوں کا جواب دے لو، کہیں بعد میں تم بات کرنے کے قابل ہی نہ رہ جاؤ، رات زخمی پیشانی والے تم خود تھے، یہ تو میں اندازہ لگا چکا ہوں، تمہارے ساتھ باقی دو آدمی کون تھے؟"

"میرے ہوٹل کے دو بدمعاش!"

"اب بھی اس کا حلیہ بتا دو تو لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آئے گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"شاید تم مجھ سے ڈر گئے ہو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ خوفناک انداز میں مسکرایا اور تیر کی طرح ان پر چھلانگ لگائی، لیکن ان کا دائیں ہاتھ کا مکا پہلے ہی اس کے استقبال کے لیے تیار تھا، مکا اس کی پیشانی پر لگا اور دوسری طرف الٹ گیا، محمود، فرزانہ اور فاروق ہاتھ ہی تولتے رہ گئے۔

مکا کچھ اس زور سے لگا تھا کہ کئی سیکنڈ تک سہراب خاں اُٹھ نہ سکا، آخر اٹھا اور جھومتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں نے اتنا شاندار مکا آج تک نہیں کھایا، اس لیے جو
تم پوچھو گے ضرور بتاؤں گا، لیکن موقع ملنے پر اس مکے کا بدلہ
تم سے ضرور لوں گا۔" اس نے کہا۔
"پہلے تم بدلہ لے لو، پوچھ میں بعد میں لوں گا۔" انسپکٹر جمشید
مسکرائے۔
"تم سمجھتے ہو، میں تم سے کمزور ہوں، یہ مکا میں دھوکے میں
کھا گیا۔" اس نے جھلا کر کہا۔
"چلو اب دھوکا نہ کھانا۔"
"شاید آج تمہاری موت ہی آ گئی ہے۔"
یہ کہتے ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، انسپکٹر جمشید اس
سے پہلے ہی اٹھ چکے تھے اور چکر کاٹ کر اس کے سامنے
آ گئے تھے، دونوں چند لمحے تک کھڑے ایک دوسرے کو گھور
رہے تھے۔ اچانک سراب خاں ہوا میں اچھلا اور انہیں
یوں لگا جیسے وہ اڑتا ہوا ان کی طرف آیا ہو، دوسرے ہی
لمحے وہ انہیں اپنے ساتھ لیتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا، انسپکٹر
جمشید کوشش کے باوجود اس کی لپیٹ میں آنے سے بچ نہ
سکے تھے اور صرف یہی نہیں ہوا، اس کے دونوں ہاتھ بھی
ان کی گردن پر جم گئے۔ وہ دباؤ ڈالنے لگا، محمود، فاروق اور
فرزانہ بوکھلا گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے، سراب خاں

اس طرح یکایک ان پر چھا جائے گا، پھر محمود اپنی جگہ سے اٹھ
کر ان کی مدد کے ارادے سے آگے بڑھا۔
"نہیں محمود! ابا جان اسے پسند نہیں کریں گے، اگر سراب
خاں نے حملہ دھوکے سے کیا ہوتا تو ہم ضرور کچھ کر سکتے تھے۔"
فرزانہ نے جلدی سے کہا۔ محمود نے مڑ کر فاروق کی طرف دیکھا۔
جیسے اس کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہو۔
"فرزانہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔"
"بہت اچھا۔" محمود نے کہا اور واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔
دوسری طرف سراب خان برابر انسپکٹر جمشید کی گردن پر دباؤ
ڈال رہا تھا۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، اور پھر اچانک ہی سراب
خاں کسی فٹ بال کی طرح ہوا میں اچھل گیا۔ محمود، فاروق اور
فرزانہ حیرت زدہ رہ گئے۔ ہوا یہ تھا کہ انسپکٹر جمشید نے دونوں
ٹانگیں سراب خاں کے سر تک لا کر اس کے دونوں طرف
جما دی تھیں اور پھر انہوں نے زور سے اسے اچھال پھینکا تھا۔
سراب خاں دیوار سے ٹکرایا، اس کے منہ سے ایک دل دوز
چیخ نکلی، انسپکٹر جمشید پھرتی سے اٹھے اور اس کے سر پر
پہنچ گئے، لیکن اس میں تو اب دم خم رہ ہی نہیں گیا تھا،
انہوں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور ایک
کرسی میں ڈال دیا۔

"اب تم مجھے اس آدمی کا حلیہ بتاؤ گے اور اگر زبان کھولنے
میں دیر لگائی تو اس مرتبہ اتنا اونچا اچھالوں گا کہ تمہارا سر چھت
سے جا ٹکرائے گا اور بھیجا پاش پاش ہو جائے گا۔"

"نہیں!" سراب خاں خوف زدہ انداز میں چلّایا۔

"تو پھر بتاؤ۔" انسپکٹر جمشید غرّائے۔

"بتاتا ہوں۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا، چند لمحے تک سانس
درست کرتا رہا، آخر بولا:

"اس کی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ تھا، نیلا سوٹ پہنے ہوئے
تھا، باریک مونچھیں تھیں اور ٹھوڑی میں گڑھا۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور
فرزانہ کا برا حال تھا، وہ اسے اس طرح گھور رہے تھے جیسے
وہ کوئی پاگل ہو۔ وہ اس آدمی کا حلیہ بتا رہا تھا جو آئی جی صاحب
کے چپراسی کو زرد لفافہ دے گیا تھا، اور پھر ملازمت کے سلسلے
میں جبار باقر کے گھر گیا تھا تو سرخ فائل وہیں چھوڑ آیا تھا،
اس وقت سرخ فائل میں کاغذات کی بجائے انسپکٹر جمشید کی
تصویر تھی جس کے سینے میں خنجر گڑا تھا، پھر وہ نوجوان ان
کے گھر بھی آیا تھا اور اپنی کہانی انہیں سنائی تھی کہ کس طرح
وہ بیکاری کے دن کاٹ رہا ہے اور ملازمت کے لیے مارا
مارا پھر رہا ہے، کسی آدمی نے اس کے ذریعے خط آئی جی کے

چپراسی تک بھجوایا اور پھر فائل انسپکٹر جمشید کو دے کر آنے کے
لیے کہا، لیکن وہ فائل وہ کہیں بھول آیا... اور یہی بتانے کے
لیے وہ ان کے پاس آیا تھا، اس نے اپنا پتا بھی بتایا تھا اور
پھر وہ ان کے گھر سے نکلا تو ایک فائر ہوا تھا اور انہوں
نے اسے تڑپتے دیکھا تھا، پھر دھوئیں کا ایک بم پھٹا تھا
اور ہر طرف دھواں پھیل گیا تھا، دھواں چھٹنے کے بعد اس کی
لاش نظر نہیں آئی تھی، بعد میں اس کے بتائے ہوئے پتے
پر پہنچے، لیکن وہاں ایک اور ہی شخص موجود تھا اور اس
نے اپنا نام نزاکت رفیق بتایا تھا، یہ بھی بتایا کہ وہی اس گھر
کا مالک ہے، کسی سنہری فریم کے چشمے والے سے اس کا
تعلق نہیں اور اس جگہ آ کر تفتیش کی گاڑی رک گئی تھی۔ اب
سراب خاں نے یہ حیرت انگیز بات بتائی تھی کہ اس سے یہ
سارا کام لیا ہی اس نوجوان نے تھا، لیکن وہ نوجوان تو ختم
کر دیا گیا تھا، انہوں نے سڑک پر اپنی آنکھوں سے خون دیکھا
تھا... تب پھر اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی اس کے ذریعے
سے کام لے رہا تھا، تاکہ پھنسے تو صرف وہ، شک کیا جائے
تو صرف اس پر اور اصل مجرم بالکل محفوظ بیٹھا رہے۔

اور اس وقت انہوں نے محسوس کیا کہ اس مرتبہ ایک
ایسے ذہین مجرم سے واسطہ پڑا ہے جس کا دُور دُور تک کوئی

پتا نہیں۔ سراب خاں کو مکان میں بند کر کے وہ وہاں سے نکل آئے۔

"اب آپ کیا کریں گے ابا جان!" فرزانہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"اس کیس میں ہمیں بہت بے وقوف بنایا گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی... کیا مطلب؟ میں نے تو ایک بار بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ بے وقوف بن رہا ہوں۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اگر محسوس کر لیتے تو پھر تم بے وقوف ہرگز نہ کہلاتے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن ابا جان! بے وقوف تو میں اب بھی نہیں کہلاتا، میں تو فاروق کہلاتا ہوں اور فاروق کے معنی ہرگز ہرگز بے وقوف کے نہیں ہیں۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"اگر تم بے وقوف نہیں ہو تو بتاؤ، مجرم کون ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"بھلا یہ میں کس طرح بتا سکتا ہوں، کیا آپ اندازہ لگا چکے ہیں۔" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں! میں اندازہ لگا چکا ہوں، اور اب ہم اس کی طرف جا رہے ہیں۔ اکرام تمہیں ایک کام کرنا ہے اور بہت ہوشیاری

سے کرنا ہے۔" ان کا لہجہ پرجوش تھا۔

"جی فرمائیے۔"

وہ اسے ایک طرف لے گئے اور اس کے کان میں کچھ کہنے لگے۔ فوراً ہی اکرام نے سڑک پر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک سمت میں چلا گیا۔ انسپکٹر جمشید ان کے قریب چلے آئے، انہوں نے ایک ٹیکسی روک لی، اس میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے کہا:

"فی الحال سیدھے چلتے رہو۔"

"جی بہتر۔"

"ابا جان! آپ نے بتایا نہیں، مجرم کون ہے۔" محمود نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ذہن پر زور دو، ہر بات مجھ سے نہ پوچھا کرو۔" انہوں نے منہ بنا کر کہا۔

"لیکن ابا جان! اب اس کو گرفتار کر کے ہمیں کیا فائدہ ہوگا، فائل تو وہ اپنے ملک بھیج بھی چکا ہوگا۔"

"ہاں! وہ فائل بھیج چکا ہوگا، تو پھر.... کیا اسے آزاد چھوڑ دیں۔" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔

"اوہ نہیں، گرفتار تو اسے کرنا ہی ہوگا، یہ اور بات ہے کہ ہماری یہ کامیابی بہت دردناک ہوگی۔" فرزانہ کے لہجے

میں حد درجے افسوس تھا۔

"دردناک کامیابی.... اس کامیابی کا نام میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ سنا ہے۔" فاروق نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"ابھی نہ جانے کتنی باتیں تم زندگی میں پہلی بار سنو گے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"میرا خیال ہے، فرزانہ نے ٹھیک ہی کہا ہے، یہ کامیابی واقعی دردناک ہوگی۔" محمود بولا۔

انسپکٹر جمشید ٹیکسی ڈرائیور کو راستہ بتاتے جا رہے تھے۔ اچانک ٹیکسی رک گئی۔ انہوں نے دیکھا، وہ اپنے گھر کے سامنے رکے تھے۔

بھیانک سازش

"یہ کیا ابا جان! آپ نے تو کہا تھا، ہم مجرم کی طرف جا رہے ہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"شاید مجرم ہمارے گھر میں ہی ہے، ورنہ ابا جان یہاں کیوں آتے۔" فاروق بولا۔

"وہ ہمارے گھر میں کیسے ہو سکتا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"تم تو اس طرح کہہ رہی ہو جیسے ہمارے گھر میں کبھی کوئی مجرم آیا ہی نہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"مجھے یہاں سے ایک چیز لینی ہے، تم ٹیکسی میں ہی بیٹھے رہو۔" انسپکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دھت تیرے کی.... آج تو ابا جان بھی ہم سے مذاق کر رہے ہیں۔" محمود نے ران پر ہاتھ مارا۔

"چلو اچھا ہے، تین سے چار بھلے، اب چاروں مل کر مذاق کیا کریں گے۔" فاروق ہنسا۔

"تو بے چاری امی جان کیوں الگ رہیں، انہیں بھی شامل

کر لیں گے۔" فرزانہ کے لہجے میں معصومیت تھی جس پر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

اتنے میں انسپکٹر جمشید باہر آتے نظر آئے، ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے پھر ٹیکسی ڈرائیور کو راستہ بتایا کہ کس طرف چلنا ہے۔

"آپ انہیں ایک بار ہی کیوں نہیں بتا دیتے کہ کہاں جانا ہے؟"

"اس لیے کہ تم ذہن پر زور نہیں دے رہے، اس طرح تمہیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"یہ بات تو طے ہے کہ اب ہم مجرم کی طرف جا رہے ہیں؟" محمود نے پوچھا۔

"بالکل!"

"تب ہم تینوں سوچ کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں اور جب ابھریں گے تو مجرم کا نام سمندر کی تہہ میں سے نکال چکے ہوں گے۔" فرزانہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"آج تک تو سمندر کی تہہ سے موتی وغیرہ نکالے جاتے رہے ہیں، اب مجرموں کے نام نکلا کریں گے۔" فاروق نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"میں سوچ کے سمندر کی بات کر رہی ہوں۔" فرزانہ نے تلملا

کر کہا۔

"سمندر سمندر ہی ہوتا ہے، وہ سوچ کا ہو یا وہم کا۔" فاروق نے بڑے بوڑھوں کے سے انداز میں کہا۔

"اچھا خاموش رہو، سمندر کے اندر بولنا نہیں چاہیے، منہ میں پانی گھس آئے گا۔" فرزانہ مسکرائی۔

اور تینوں واقعی سوچ میں ڈوب گئے۔ ٹیکسی چلتی رہی، انسپکٹر جمشید ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے تھے، وہ دبی آواز میں اسے راستہ بتاتے رہے۔ دوسری طرف تینوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ اور ٹیکسی کے ہچکولوں کی وجہ سے کبھی کبھی ان کے سر آپس میں ٹکرا بھی جاتے تھے، رات ابھی زیادہ نہیں ہوئی تھی، سردی کے باوجود سڑکوں پر آمد و رفت تھی۔

اچانک ٹیکسی کے بریک چرچرائے، لیکن انہوں نے سر اوپر اٹھا کر بھی نہ دیکھا:

"بھئی اب اپنے سمندر سے نکل بھی آؤ، آخر ہم کب تک ٹیکسی میں بیٹھے رہیں گے۔" انسپکٹر جمشید کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"لیکن ابا جان! ابھی ہم کس طرح نکل سکتے ہیں، سمندر میں تو دور دور تک مجرموں کا نام موجود نہیں۔" فاروق بولا۔

"بس معلوم ہو گیا، تمہارے ذہن ناکارہ ہو گئے ہیں، تم نے

ان سے کام لینا چھوڑ دیا ہے، میں اس کیس سے فارغ ہونے کے بعد تم تینوں کی خبر لوں گا۔"

"ابا جان! ابھی تک ہم نے سر اوپر نہیں اٹھائے، یہ ٹھیک ہے نا؟" محمود نے کہا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔"

"تو پھر ہم تینوں بتا سکتے ہیں کہ کس کے گھر کے سامنے کھڑے ہیں۔"

"جلدی بتاؤ، وقت نہ ضائع کرو۔"

"تو پھر سنیے! ہم نزاکت رفیق کے گھر کے سامنے کھڑے ہیں، یعنی شام نگر کی گلی نمبر تیرہ کے مکان نمبر نو کے سامنے۔" تینوں ایک ساتھ بولے تھے۔

جواب میں انہیں انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی نہ دی۔ انہوں نے چونک کر اوپر دیکھا، انسپکٹر جمشید پیار بھری نظروں سے انہیں گھور رہے تھے اور وہ واقعی نزاکت رفیق کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔

○

انسپکٹر جمشید نے آگے بڑھ کر دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھل گیا اور وہی نوجوان دکھائی دیا جس نے اپنا نام نزاکت رفیق بتایا تھا۔

"آپ... آپ شاید پہلے بھی آ چکے ہیں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں! ہم نے آپ سے ایک سنہری فریم کے چشمے والے نوجوان کے بارے میں معلوم کیا تھا، کیونکہ اس نے ہمیں آپ کے گھر کا پتا بتایا تھا۔"

"ہاں! مجھے یاد آ گیا۔" اس نے سر ہلایا۔

"ہم آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید سرسری لہجے میں بولے۔

"کیسی باتیں؟" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"کیا آپ ہمیں اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہیں گے، سردی بہت ہے اور دروازے میں کھڑے رہ کر باتیں کرنا یوں بھی کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"اوہ! ضرور... آئیے۔" اس نے کہا اور دروازے سے ہٹ گیا۔

وہ اندر آئے۔ مکان تین کمروں کا تھا۔ ان میں سے ایک ڈرائینگ روم تھا، وہ انہیں اس میں لے آیا، وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے، محمود، فاروق اور فرزانہ کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔

"بات دراصل بہت عجیب ہے اور آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم کون ہیں اور یہ کیا معاملہ ہے، لیکن ابھی جب میں آپ کو ساری بات تفصیل سے سناؤں گا تو آپ پوری طرح سمجھ

جائیں.....“

ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے، اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی تھی، نوجوان نے چونک کر کہا:

”اوہ! معاف کیجیے... میں دیکھتا ہوں، کون ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔

”ابا جان! کہیں وہ فرار نہ ہو جائے۔“ فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

”نہیں! وہ بھاگ نہیں سکے گا۔“ انسپکٹر جمشید کے لہجے میں یقین تھا۔

اسی وقت انہوں نے بھاری بوٹوں کی آواز سنی۔ تینوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، وہ مسکرا اُٹھے، ان کی نظریں ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ نزاکت رفیق پولیس آفیسروں کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ آفیسروں میں آئی جی اور ڈی آئی جی بھی تھے البتہ اکرام انہیں نظر نہ آیا۔

”یہی ہیں وہ لوگ۔“ نزاکت رفیق نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کی نظریں جوں ہی انسپکٹر جمشید اور ان پر پڑیں، وہ بھونچکے رہ گئے۔ دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا:

”یہ کیا... یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”کیا مطلب...؟“ نوجوان نزاکت رفیق نے حیرت زدہ لہجے میں کہا: ”آپ ہی نے تو دروازے پر یہ کہا تھا کہ میرے گھر میں ابھی ابھی کچھ غلط لوگ داخل ہو گئے ہیں، اور یہ کہ آپ کو وقت پر اطلاع مل گئی ہے، اس لیے آپ انہیں گرفتار کرنے کے لیے آ گئے ہیں۔“ وہ کہتا چلا گیا۔

”ہاں! ہمیں کسی نے گمنام فون کیا تھا، لیکن یہ تو انسپکٹر جمشید اور ان کے بچے ہیں۔“

”کیا؟“ نزاکت رفیق بری طرح اچھلا۔

”ہاں! انہوں نے بے شک اپنے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی کر رکھی ہے، لیکن ہم انہیں اس میک اپ میں بہت مرتبہ دیکھ چکے ہیں۔“

”اوہ!“

”وہ فون آپ کو میرے ہی ایک آدمی نے کیا تھا۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”کیا مطلب؟“ دونوں چونکے۔

”آپ مجھے محکمے سے نکال چکے ہیں، اس لیے اگر میں آپ کو یہاں بلواتا تو آپ شاید نہ آتے، اس لیے میں نے اکرام کے ذریعے گمنام فون کرایا تھا۔“

”اوہ۔“ وہ دھک سے رہ گئے۔ پھر آئی جی بولے:

"لیکن بات کیا ہے، آخر یہ ڈرامہ رچانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"فائل اڑانے والا مجرم آپ کے حوالے کرنا تھا، یہی وہ شخص ہے جس نے سہراب خان اور اس کے دو ساتھیوں کی مدد سے فائل میرے گھر سے اڑائی تھی۔"

"کیا!!!" نہ صرف آئی جی اور ڈی آئی جی بلکہ خود نزاکت رفیق بھی اچھلا تھا۔

"جی ہاں! میرے پاس اس کے خلاف ثبوت موجود ہے، نمبر ایک تو یہ کہ اس کے ہاتھ کی تحریر اس روز لفافے میں موجود تھی جو اب آپ کے پاس ہے، دوسرے یہ کہ اس شخص کو سہراب خان کے علاوہ جبار باقر بھی شناخت کر لیں گے۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن کیسے ابا جان! اس کا حلیہ تو اور تھا اور اسے تو ہلاک کر دیا گیا تھا۔"

"جب ہم اس کی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگائیں گے، نیلے کپڑے پہنائیں گے، باریک باریک مونچھیں لگائیں تو یہ نوجوان خود بخود وہی نظر آنے لگے گا۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"اور ٹھوڑی میں گڑھا کیسے بنائیں گے۔" فاروق نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ بھی کچھ مشکل نہیں، پلاسٹک کا ایک ننھا سا ٹکڑا اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگاتے ہی گڑھا نمودار ہو جائے گا، یہ ٹکڑا بالکل

ال کے رنگ کا ہوگا، اور یہ چیزیں میں اپنے ساتھ لایا
ں، ادھر اکرام جبار باقر کو بھی لے کر پہنچنے والا ہوگا، دو
دمیوں سے کہیے، اسے دونوں طرف سے جکڑ لیں۔"

فوراً چار کانسٹیبل آگے بڑھے اور انہوں نے نوجوان کو بازوؤں میں جکڑ لیا۔ انسپکٹر جمشید نے جیب میں سے چند چیزیں نکالیں، پھر نوجوان کی طرف بڑھے۔ پہلے اس کی آنکھوں پر عینک لگائی، پھر مونچھیں چپکائیں، اس کے بعد ٹھوڑی کے نیچے پلاسٹک کا ٹکڑا لگا دیا۔ چشم زدن میں اس کی شکل صورت بالکل بدل گئی اور وہ انہیں اسی حلیے کا نوجوان نظر آنے لگا جو وہ اب تک سنتے رہے تھے، اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔

"محمود... تم جا کر دروازہ کھول دو۔"

جلد ہی اکرام جبار باقر کے ساتھ اندر داخل ہوتے نظر آئے، پھر جونہی ان کی نظر اس نوجوان پر پڑی، وہ چلا اٹھے:

"ارے! یہ تو وہی نوجوان ہے جو فائل چھوڑ گیا تھا۔"

○

اس
جکا
گول یہی پکار اٹھے گا۔ اس کے ہاتھ کی تحریر
"سہراب خان ج— ہے، لہٰذا ثبوت مکمل ہے، آپ اسے
ہمارے پاس موجود ہو

گرفتار کر سکتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم اسے گرفتار کر سکتے ہیں، اور اس میں اب کوئی شک نہیں رہ گیا کہ یہی وہ نوجوان تھا لیکن افسوس، فائل تو یہ اب تک اپنے ملک میں پہنچا بھی چکا ہو گا۔" آئی جی کے لہجے میں حد درجے افسوس تھا۔

"کیوں مسٹر نزاکت ——— فائل کہاں ہے۔"

"تم ہار گئے انسپکٹر جمشید، میں کامیاب ہو گیا، میرا منصوبہ کامیاب رہا، یہ زبردست سازش میرے دماغ نے ہی تیار کی تھی، ایک طرف فائل حاصل کر کے اپنے ملک بھیج دی اور دوسری طرف تمہیں ملازمت سے نکلوا دیا۔ یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ تم بے حد ذہین ہو اور مجھ تک پہنچ ہی گئے۔ جب کہ میں یہ سمجھا تھا کہ تمہارے فرشتے بھی میرے بارے میں اندازہ نہ لگا سکیں گے۔" وہ پُر غرور انداز میں کہتا چلا گیا۔

"اور میں شاید اندازہ لگا بھی نہ سکتا... اگر میں سراب خان تک نہ جا پہنچتا، جب اس نے مجھے بتایا کہ اس سے کام لی
دالا وہی نوجوان تھا جو آئی جی صاحب کے چپراسی کو [illegible] اڑایا گیا"
گیا تھا اور جو جبار باقر کے گھر میں فائل چھوڑ گیا تھا
فائل کہیں بھول جانے کی کہانی سنانے کے لیے نے مذاق اڑانے
پہنچ گیا تھا، پھر وہ گھر سے باہر نکلا تو فائر کی آوا

رہا تھا... دراصل اس نے خود ہی فائر کیا تھا اور یہ فائر ربڑ کی اس تھیلی پر کیا تھا جس میں یہ کسی خون کے بنک سے ایک بوتل خرید کر لے آیا تھا، پھر ایک اور دھماکا ہوا تھا، تڑپتے تڑپتے اس نے دھوئیں کا بم بھی زمین پر دے مارا تھا، دھواں پھیلتے ہی اس نے چہرے پر گیس ماسک چڑھا لیا جس کی وجہ سے دھوئیں نے اسے نقصان نہ پہنچایا اور یہ دھوئیں کی آڑ میں وہاں سے نکل گیا، تاکہ ہم یہی سمجھیں کہ مجرموں نے اپنے جرم کا نشان مٹانے کے لیے لاش کو غائب کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، اس کا پروگرام بہت زبردست تھا، لیکن اس نے سراب خان کے سامنے اسی میک اپ میں آ کر بہت بڑی غلطی کی اور اگر یہ غلطی نہ کرتا تو میں جانے کب تک اسے تلاش کرتا رہتا اور یہ مجھ پر قہقہے لگاتا رہتا۔"

"لیکن میں پھر کہوں گا... فائل کھونے کے بعد اگر مجرم ہمارے
آ بھی گیا تو کیا حاصل۔" آئی جی بولے۔
نام آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ فائل اب تک
ہمارے کہیں موجود ہو گی۔"
آدمیوں کو گویا ہوں انسپکٹر، فائل تو میرے ملک میں پہنچ بھی چکی
نزاکت رئیس کو گولی بھی ماری جا چکی ہو گی جن کے نام

"اوہ!" ڈی آئی جی بھونچکے رہ گئے۔

"کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ ایسا ہو چکا ہوگا؟" انسپکٹر جمشید نے اسے گھورا۔

"ہاں! میں نے فائل پر لکھ دیا تھا، ان لوگوں کو فوراً گولی سے اڑا دیا جائے۔"

"اس کا مطلب ہے، تم اپنے ملک کی کوئی بہت خاص ہستی ہو۔"

"ہاں! میری ہدایت پر فوراً عمل کیا گیا ہوگا۔"

"بہت خوب! میں تمہارے منہ سے یہی الفاظ سننا چاہتا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے خوش ہو کر کہا۔

سب نے انہیں مسکراتے دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

"کیا مطلب جمشید! تم اس کے منہ سے یہی الفاظ سننا چاہتے تھے، یعنی تم یہ سننا چاہتے تھے، ہمارے جو وطن پرست اس کے ملک میں کام کر رہے ہیں، انہیں گولی سے اڑا دیا گیا ہے۔" ڈی آئی جی صاحب نے تلملا کر کہا۔

"بے فکر رہیں، ہمارے جاسوسوں کو گولی سے نہیں اڑایا گیا۔" انسپکٹر جمشید ٹھہری ہوئی آواز میں بولے۔

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟" نزاکت رفیق نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"اس طرح!"

یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید نے اپنے کوٹ کے اندر ہاتھ داخل کر دیا اور جب ان کا ہاتھ باہر نکلا تو اس میں سرخ فائل موجود تھی۔

"یہ کیا..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" نزاکت رفیق حلق پھاڑ کر چلایا۔

"یہ ہو چکا ہے بے وقوف..... جو فائل تم نے سراب خال کے ذریعے اڑائی، وہ نقلی تھی، جس روز یہ فائل مجھے سونپی گئی تھی، میں نے اسی روز اس کے بالکل مطابق ایک فائل تیار کر لی تھی اور اس فائل میں ان لوگوں کے نام اور پتے شامل کیے تھے جو تمہارے ملک میں ہمارے جاسوسوں کو ڈھونڈنے میں مصروف ہیں، یہ آدمی اس قدر خفیہ ہیں کہ ان کا بظاہر کسی بھی محکمے سے تعلق نہیں اور رہتے بھی میک اپ میں ہیں، لہٰذا تم نے فائل جن لوگوں کو بھیجی، ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی ہو گی کہ فائل میں کن لوگوں کے نام ہیں اور یہ بھی بتا دوں کہ یہ نام اور پتے ابھی کچھ ہی روز پہلے تمہارے ملک میں موجود ہمارے ایک کارکن نے بھیجے تھے۔ اس طرح تم نے اپنے ہی آدمیوں کو گولیوں سے اڑوا دیا ہے۔ اب کہو کیا کہتے ہو؟"

نزاکت رفیق کا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا، وہ آنکھیں

پھاڑے انسپکٹر جمشید کو گھورنے لگا، ایک وہی کیا، اس وقت تو
انہیں سبھی گھور رہے تھے. کسی کو بھی اس کایا پلٹ کی ایک فیصد
بھی امید نہیں تھی، انہیں یوں لگا جیسے انسپکٹر جمشید اس دنیا کے
نہیں، کسی اور دنیا کے انسان ہوں... لیکن وہ تو اب تک
مسکرا رہے تھے اور ان کی یہ مسکراہٹ ان سے کہہ رہی تھی میں
اسی دنیا کا ہوں، اور آپ میں سے ہی ہوں۔ پھر آئی جی صاحب
کی آواز ابھری:

"جمشید! مجھے معاف کر دو، تم بہت عظیم ہو، سب کچھ جانتے
تھے، پھر بھی محکمے سے نکلنا منظور کر لیا، اگر تم مجھے اشارہ بھی
کر دیتے تو ظاہر ہے، کبھی نہ نکالے جاتے۔"

"میں نزاکت رفیق کو یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس نے جو
فائل حاصل کی ہے، وہ نقلی نہیں ہے۔ جب مجھے ملازمت
سے نکال دیا گیا تو اسے پختہ یقین ہو گیا اور اس نے فائل
سرحد پر موجود اپنے کسی ساتھی کے حوالے کر دی۔ دوسرا فائدہ
اس سے یہ ہوا کہ یہ سمجھ بیٹھا کہ میرا خیال تک اس تک نہیں
پہنچ سکتا۔" وہ کہتے چلے گئے۔

"اب تم صبح اپنی ملازمت پر آ جاؤ گے... میں تم سے بڑا ہوں،
اور تم سے معافی مانگتا ہوں۔" آئی جی بولے۔

"مجھے شرمندہ نہ کریں، ہاں کل میں شاید دفتر نہ آسکوں گا،

کیونکہ کل خان رحمان مچھلی کے شکار کا پروگرام بنا چکے ہیں،
پروفیسر داؤد بھی ساتھ ہوں گے اور ہاں! آپ کو پہلے ان دونوں
صاحبان سے بات کرنا ہو گی، کیونکہ یہ مجھ سے وعدہ لے چکے
ہیں کہ میں اب واپس ملازمت پر نہیں جاؤں گا۔" انہوں نے
مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو، میں ان سے بات کر لوں گا، اور تم نے کیا
کہا... کل نہیں آسکو گے، چاہو تو دس دن تک شکار کھیل سکتے ہو۔"

"معاف کیجیے گا انکل، ہمارے پاس اتنے کانٹے اور
بنسیاں نہیں ہیں کہ دس دن تک شکار کھیلتے رہیں۔" فاروق نے
مسمی صورت بنا کر کہا اور سب نے ایک قہقہہ لگایا۔

"بلکہ ہمارے پاس تو سرے سے ہی کوئی کانٹا اور بنسی
نہیں ہے۔" محمود نے ٹکڑا لگایا۔

"جی ہاں! یہ سب سامان تو خان رحمان لے کر آئیں گے،
ہم تو مفت میں شکار کا لطف اٹھائیں گے۔" فرزانہ بولی۔

"جب کوئی بات نہ سوجھے تو اِدھر اُدھر کی نہ ہانکا
کرو، خاموش رہا کرو، تم نے میرے جملے کا مزا
بھی کرکرا کر دیا، ویسے یہ بات آج تک میری سمجھ
میں نہیں آئی کہ مزا کس طرح کرکرا ہو سکتا ہے، چیزیں
تو ریت اور مٹی وغیرہ سے کرکری ہوتی ہیں اور مزے

کا ریت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، یہ بات اس وقت تو کہی جا سکتی تھی جب ریت مزے کی رشتے دار ہوتی۔"

فاروق رُکے بغیر کہتا چلا گیا، یہاں تک کہ اس کی آواز قہقہوں میں دب گئی۔!!